ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

پاکیزہ سیرت و کردار کی تعمیر اور

فرد و اجتماع کی اصلاح و تربیت کیلئے

بہترین کتب

۱۔ راہِ عمل	مولانا جلیل احسن ندوی	اعلیٰ ایڈیشن	۷/-
(مجموعۂ انتخاب حدیث)		سستا ایڈیشن	۵/-
۲۔ اذکارِ مسنونہ۔ تالیف۔ علامہ ابن قیمؒ		اعلیٰ ایڈیشن	۵۔۵
ترجمہ و تشریح۔ خلیل احمد حامدی		سستا ایڈیشن	۳/-
۳۔ مسلمان کے شب و روز۔ اسعد گیلانی		اعلیٰ ایڈیشن	۵/-
		سستا ایڈیشن	۲۔۲

اعلیٰ کتابت و طباعت۔ حسین پیشکش

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۔ ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

۵۔ بیت المکرم، پہلی منزل، ڈھاکہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انسان پر انسان کی خدائی کی یوں تو متعدد صورتیں ہیں مگر اسے قائم کرنے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک راستہ یہ ہے کہ خدائی قائم کرنے والا لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرے کہ وہ بعض ایسی خصوصیات کا حامل ہے جن کی بنا پر اُسے اَنَا رَبُّکُمْ کا دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے۔ خدائی قائم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو سب سے پہلے حیوان بنایا جائے، داخلی طور پر اُسے منضبط کرنے والے جتنے اخلاقی محرکات ہیں انہیں ختم کیا جائے، اس کے سفلی جذبات کو بھڑکایا جائے اور وہ جب بپھر کر معاشرے کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے لگے اور عوام کے لیے پُرامن طور پر جینا دوبھر کر دے تو پھر بے رحم قانونی شکنجوں کے ذریعے اُسے کسی نظم و ضبط کا پابند بنایا جائے۔

دورِ جدید کی پوری تاریخ انسان پر انسان کی خدائی کے اسی دوسرے طریق کے بے شمار شواہد پیش کرتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) نے لوگوں کے افکار و نظریات کے اندر تلاطم بپا کر کے جب اُن کے مذہبی جمود کو توڑا تو اسی جنون میں لوگوں نے اُن داخلی محرکات کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جو انسان کو اندر سے کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند بنائے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حریتِ افکار کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر چھپی ہوئی حیوانیت بھی بے قابو ہونے لگی۔ اس چیز کو لوگوں نے "آزادی کی برکات" خیال کیا اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات پر غور کرنے کے بجائے اس کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کرنے لگے۔ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ آزادی کس قسم

کے خوفناک نتائج پیدا کرے گی اور مذہب اور روایات کے جن بندھنوں کو توڑنے پر لوگ اُس وقت بڑے خوش نظر آتے تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے بدلے میں انہیں نہ صرف آمریت کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈالنا پڑے گا بلکہ اپنے آپ کو بے شمار قانونی شکنجوں میں کسوا کر زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

انسانی زندگی پر جب ذرا گہری نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر حیوانیت اور روحانیت دونوں اس طرح ایک دوسری میں سموئی ہوتی ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ روحانیت یا اخلاقی احساس انسان کی تہذیب کرتا ہے اور اس کی حیواتی قوت کو کسی صحیح راہ پر لگاتا ہے۔ چونکہ انسان کی حیوانی خواہشات پر انسانی بقا کا دارومدار ہے اس لیے ان میں غیر معمولی قوت ودیعت کر دی گئی ہے۔ اب اگر ان قوتوں کو داخلی طور پر اپنی فطری حدود کے اندر رکھنے کا انتظام نہ کیا جائے تو یہ سرکش اور باغی ہو کر نہ صرف فرد کی زندگی کو برباد کر دیتی ہیں بلکہ پورے معاشرے کو تہ و بالا کر ڈالتی ہیں۔ اس لیے اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے جکڑ بندی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ یہ آمرانہ جکڑ بندیاں ہر اُس نظام کا ناگزیر حصہ ہیں جس کی بنیاد الحاد پر اٹھائی گئی ہو خواہ یہ نظام سرمایہ دارانہ جمہوریت ہو، فسطائیت ہو یا اشتراکیت

سطح بین آنکھیں ممکن ہے ان تینوں نظاموں کی جکڑ بندیوں میں کوئی نوعی فرق دیکھتی ہوں، مگر حقیقت میں ان کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ نوعی نہیں بلکہ ارتقاء کی مختلف منازل کا ہے۔ مثلاً جدید سرمایہ داری کے آغاز میں اگرچہ دولت پرستی نے مذہبی اقدار کو انسانوں کی نظر میں بے وزن بنا دیا تھا مگر معاشرے میں مستحکم روایات کا احترام کسی حد تک موجود تھا اور شریف لوگ ان روایات کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے عام انسان اندر سے اتنا بے قابو نہ ہونے پایا تھا جتنا کہ آگے چل کر ہو گیا۔ اخلاقی ضابطۂ حیات سے بغاوت کا جو رجحان آغاز میں ابھرا تھا اس نے رفتہ رفتہ اس قدر شدت اختیار کی کہ وہ اپنے ساتھ روایات کو بھی بہا لے گیا۔ لوگوں نے روایات

کو بھی بیکار کی زنجیریں سمجھ کر انہیں توڑنا شروع کیا اور اس طرح پورا معاشرہ ہمہ گیر فساد کی لپیٹ میں آ گیا۔ آخر کار یہ محسوس ہونے لگا کہ انسانوں کی اس سرکشی کو فسطائیت کا آہنی نظام ہی روک سکتا ہے، چنانچہ یورپ کے مختلف ممالک میں فسطائیت نے اپنا تسلط قائم کیا۔

یورپ میں مذہب کے خلاف بغاوت کی شدید لہر پروٹسٹنٹ تحریک کی صورت میں نمودار ہوئی۔ عام لوگ اس تحریک کو ایک ایسی مذہبی تحریک خیال کرتے تھے جس کا مقصد رومن کیتھولک مذہب کے جمود کو توڑنا اور اس کے اندر جمع شدہ غلاظتوں کو صاف کرنا تھا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ پروٹسٹنٹ تحریک اصلاحِ مذہب کی کوئی تحریک نہیں تھی بلکہ مذہب سے انحراف اور بغاوت کا ایک زبردست رجحان تھا۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے عوام کو مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے وہی حربے اختیار کیے جو عام طور پر اس سلسلے میں کیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اہلِ مذہب کے جمود اور ان کی بداعمالیوں کے افسانے گھڑے گئے اور انہیں بڑی شدت کے ساتھ عوام میں پھیلایا گیا۔ پھر حقیقی مذہب کی تعریف کی گئی اور اس کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا جانے لگا اور لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ مذہبی طبقے نے مذہب کی جو حدود و قیود قائم کر رکھی ہیں اور جن اخلاقی پابندیوں کا وہ عوام سے تقاضا کرتا ہے، اصل مذہب کا ان سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ مذہب تو روشن خیالی اور ترقی پسندی کا نام ہے۔ اس لیے روشن خیالی اور ترقی کے نام پر جو کچھ کر لیا جائے وہی مذہب کا مقصد و مدعا ہے۔ اس قسم کی غلط تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ نہ صرف اہلِ مذہب سے بیزار ہوتے بلکہ مذہب نے اوامر و نواہی کا جو نظام قائم کر رکھا تھا اور خیر و شر کے جو پیمانے انسانیت کو دیئے تھے ان سب کے خلاف حقارت کا ایک شدید جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ روایات کی بھی تذلیل ہونے لگی اور لُطف کی بات یہ ہے کہ فساد کا یہ سارا کھیل مذہب کے نام پر کھیلا گیا۔ "اصلاحِ مذہب" کی ان تحریکات نے آمریت کو جنم دیا۔ جرمنی میں مارٹن لوتھر کی تحریک کے نتیجے میں فسطائیت نے جنم لیا اور انگلستان میں یہ سارا کام بادشاہت کی نگرانی

میں سرانجام پایا۔ بادشاہت کے زوال کے بعد جب یورپ کے مختلف ممالک میں جمہوریتیں قائم ہوئیں تو وہ بھی انسان پر انسان کی خدائی کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ خدا کے بلند و بالا مقام پر وطن اور قوم کو فائز کیا گیا اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنی زندگی میں اگر فائز المرام ہونا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ وطن کی خاطر جئیں اور اسی کی خاطر مریں اور اسی کی سربلندی کے لیے جدوجہد کریں۔ ظاہر ہے کہ بے جان وطن جس کی حیثیت ایک بت کی سی ہے، خود تو فرمان جاری نہیں کرسکتا۔ یہ فرض وہی لوگ سرانجام دیتے ہیں جو اس بت کے مجاور و محافظ ہوں چنانچہ وطن کی خدمت اور سربلندی کے نام پر ایک عیار طبقہ عوام پر مسلط ہوگیا اور اس نے اپنی خدائی کا سکہ چلانا شروع کیا۔ انسان کے بنائے ہوئے ضابطوں کو تقدس کا وہ مقام حاصل ہوگیا جو خدا کے دیئے ہوئے قوانین کو حاصل ہوتا ہے۔

مگر وطن کی خدائی بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ذرائع نقل و حمل کی حیرت انگیز ترقی نے دنیا کے دُور دراز گوشوں کو سمیٹ کر ایک دوسرے کے قریب کردیا۔ اس سے وطنیت کے تعصبات اور امتیازات ماند پڑنے لگے اور اس بت میں خُدائی کی جو کشش پیدا کی گئی تھی وہ کمزور ہونے لگی۔ دوسری طرف اخلاقی احساسات کے ختم ہونے سے انسان روز بروز بے قابو ہوتا چلا گیا۔ پہلے تو وہ اپنی انفرادی زندگی میں اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوا پھر اس نے اجتماعی زندگی میں ایک ایسی مجنونانہ روش اختیار کی جس سے معاشرے میں زبردست بگاڑ پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ ایسے مسائل پیدا ہوگئے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ جب تک اجتماعی زندگی کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ جکڑا نہیں جاتا اس وقت تک اس معاشرے کا نظم و ضبط قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی نئی صورتِ حال نے اشتراکیت اور اس کی بے رحمانہ جکڑبندیوں کو جنم دیا۔ اخلاقی احساسات کے بغیر انسان محض ایک حیوانِ ناطق ہے۔ حیوان کے لیے تین ہی مسائل ہوتے ہیں۔ مشقت کرنا، پیٹ بھرنا اور تناسُل کے سلسلے کو قائم رکھنا۔ اس لیے اسے کسی ضابطے کا پابند بنانے کا یہی آسان راستہ

ہے کہ رب بن کر انسان کے رزق کو کنٹرول کر لیا جائے۔ اس کنٹرول سے اس کی پوری زندگی کو جکڑا جا سکتا ہے۔ یہی طریقہ اشتراکیت نے اختیار کیا ہے۔

یورپ میں تو ان چاروں منازل سے گزرنے کے لیے اہلِ یورپ کو تین سو برس لگے ہیں مگر ہمارے ہاں الحاد کی تحریک اس شدت سے اٹھائی گئی ہے کہ ۲۲ سالوں میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہماری نوجوان نسلیں اس حد تک بے قابو ہو گئیں کہ بڑے سنجیدہ لوگ اس نہج پر سوچنے لگے ہیں کہ کیا اشتراکیت کی جکڑ بندیوں کے سوا ہمیں کوئی دوسرا قانون یا ضابطۂ اخلاق بھی انتشار سے بچا سکتا ہے؟ اب ذرا دین سے انحراف کی ان مختلف منازل پر نگاہ ڈالیے جن کے نتیجے میں اشتراکیت کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

پاکستان دین کی اساس پر معرضِ وجود میں آیا اور دینی جذبے سے سرشار ہو کر ہی عوام نے اس کے لیے قربانیاں دیں۔ اس وقت جبکہ عوام کے دینی جذبات و احساسات عروج پر تھے اِس بات کی اشد ضرورت تھی کہ ملک کا آئین جلد از جلد قرآن و سُنّت کی بنیاد پر تیار کر کے اُسے ملک میں رائج کر دیا جاتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ملک کی عام آبادی کا ذہن یکسو ہو جاتا۔ لوگوں کے اخلاقی احساسات، ان کی ملی روایات اور معاشرتی و ملکی ضابطوں کے درمیان کامل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی اور قوم جلد از جلد ترقی کرتی۔ مگر یہ معقول، منصفانہ اور تعمیری طرزِ عمل اختیار کرنے کے بجائے اسلامی آئین کی راہ میں مختلف روڑے اٹکائے گئے اور لادینی قوتوں کی پوری طرح ہمت افزائی کی گئی تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں دین کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ انتشار پیدا کیا جائے۔ اس ضمن میں خاص طور پر "مُلّا" کو ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ اس کی جہالت، کم علمی اور دورِ حاضر کے مسائل سے اس کی عدمِ واقفیت کے عجیب و غریب افسانے تراشے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں کی آراء دین میں وزن رکھتی ہیں انہیں مسلم سوسائٹی میں بے وزن بنا دیا جائے اور ان کی جگہ اُن لوگوں کو اُبھارا جائے جو جاہل ہونے کے باوجود مجتہد ہونے کے دعویدار

ہوں اور دین کے اندر ان کی تحریفات کو اچھالا جائے اور سرکاری طور پر اُن کی پذیرائی کی جائے ایس کام کو بڑے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سرانجام دیا گیا۔ اگر ان جاہل مجتہدین کی "تحقیقات" پر غور کیا جائے تو ان سب کا انداز ایک ہے۔ سب سے پہلے لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اہلِ مغرب اس وقت جس راہ پر گامزن ہیں وہی سلامتی کی راہ ہے اور اسی راہ پر چل کر کوئی قوم فلاح و کامرانی سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہمیں بھی مغرب کے معیارِ ترقی کو اپنانا چاہیے۔ پھر اس ضمن میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ سب "مُلّا" کی تنگ نظری اور تعصب کے نتائج ہیں، ورنہ اللہ کا دین بھلا عصرِ جدید کے افکار و نظریات سے کس طرح متصادم ہو سکتا ہے؟ اس باطل خیال کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا جاتا ہے کیونکہ سُنّت ہی سے ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے وہ ڈھانچے ملتے ہیں جنہیں قرآنی تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویریں کہا جا سکتا ہے۔ سنّت سے انحراف کے بعد قرآنِ مجید کی من مانی تاویلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور کلامِ الٰہی میں تدبّر و تفکّر کے نام پر ایسے غلط افکار و نظریات کو پیش کیا جاتا ہے جو تعلیمات الٰہی کی عین ضد ہیں۔ کہیں قرآنِ مجید سے سُود کا جواز نکالا جا رہا ہے۔ کہیں موسیقی اور بُت تراشی کے لیے دلائل فراہم کیے جاتے ہیں۔ کہیں خاندانی منصوبہ بندی کی تائید کے لیے آیاتِ قرآنی کا حلیہ بگاڑا جا رہا ہے۔ الغرض تمام وہ بُرائیاں جو مغربی دنیا میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں انہیں کسی نہ کسی طرح قرآنِ مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کا نام ان لوگوں کے نزدیک تحقیق اور خدمتِ دین ہے۔

اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان نسلوں نے اپنے آپ کو دین کے مطابق ڈھالنے کے بجائے دین کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی بعض سادہ لوح دین کے معاملے میں اس قسم کے انکشافات کو دین کی خدمت خیال کرتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ اس اندازِ فکر سے کسی معاشرے کے اندر الحاد پرورش پاتا ہے جب اس مرعوبیت کے انداز پر غور و فکر کرنے والے مفکرین نوجوان نسل کے دل و دماغ میں یہ تأثر بٹھاتے ہیں کہ ترقی اور روشن خیالی کا اصل معیار تو وہی ہے جو مغرب نے دنیا کو دیا ہے اور ہم انہی

معیار کو اپنا کر دنیا میں سربلند ہو سکتے ہیں اور اس معیار کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ قرآن مجید میں من مانی تاویلات بلکہ تحریفات کرنے میں متامل نہیں ہوتے تو نوجوانوں کے ذہنوں میں فطری طور پر یہ احساس پیدا ہو گا کہ کیوں نہ اصل معیار کو اپنا لیا جائے اور جس دین کے اندر قدم قدم پر ترمیم و تبدل کی ضرورت پیش آ رہی ہے اُسے یکسر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی اصلاحِ مذہب اور تجدیدِ دین کا یہ انداز اختیار کیا گیا وہاں لوگوں کے اندر دین سے محبت اور رغبت کا رجحان پیدا ہونے کے بجائے انحراف اور بغاوت کا رجحان پیدا ہوا۔ یورپ میں مارٹن لوتھر کی تحریکِ اصلاحِ مذہب سے الحاد کو فروغ حاصل ہوا اور ہمارے ہاں اس قسم کی "تحقیقاتی" سرگرمیوں سے نوجوان مذہب سے برگشتہ ہوئے۔

یہاں ایک طرف تو عوام خصوصاً نوجوان نسلوں کو مذہب سے بیگانہ بنانے کی سازشیں ہوتی رہیں اور دوسری طرف اس امر کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا رہا کہ انہیں اخلاقی حدود و قیود سے آزاد کیا جائے اور اسلام نے سیرت و کردار، ضبطِ نفس، عفت اور پاکدامنی کی جو درخشاں روایات قائم کی ہیں ان کے خلاف نفرت و حقارت کا عام رجحان پیدا کیا جائے۔ چنانچہ اخلاقی حدود اور ضبطِ نفس کو انسان پر بے جا دباؤ اور عفت و پاکدامنی کو تاریک خیالی سے تعبیر کیا جانے لگا۔ پھر اسلام نے تقویٰ اور پرہیزگاری کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں ان کی عیب جوئی میں اوراق سیاہ کیے جانے لگے تاکہ ان حضرات کے لیے مسلم معاشرے میں جو جذبۂ احترام موجود ہے وہ کم ہو اور وہ مغربی تصور کے مطابق یہ سمجھنے لگیں کہ انسان فطری طور پر گناہگار ہی ہے مگر اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ خدا خوفی اور خدا ترسی کی نمائش کرتا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں انسان کی سرشت کے بارے میں ترقی پسندوں نے جس قدر افسانے لکھے ہیں ان میں انسان کی اس "منافقت" کو نمایاں کیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر انسان اندر سے شیطان ہوتا ہے اور وہ محض عوام کو دھوکہ دینے اور انہیں بیوقوف بنانے کے لیے پرہیزگاری کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس لیے بہتر

یہی ہے کہ ظاہرداری کے سارے پردے چاک کر کے اور ہر قسم کے خوف سے بے پروا ہو کر انسان کھُل کر اپنے سفلی جذبات کی تسکین کرے کیونکہ اس آزاد طرزِ عمل سے ہی انسانی شخصیت کی بہتر طور پر تشکیل ہو سکتی ہے۔

ان جدید "مفکرین" اور "دانشوروں" نے مغربی فلاسفہ کی اندھی تقلید میں اس سادہ سی حقیقت پر غور کرنے سے انکار کر دیا کہ انسان کو فطری طور پر گنہگار قرار دینے اور اس سے بھُول چوک میں گناہ سرزد ہو جانے میں بڑا فرق ہے۔ اہلِ مغرب کے ہاں انسان کے بارے میں جو تصور رائج ہے اور جس کی بنیاد پر اس کے لیے اخلاقی اور سیاسی ضابطے مرتب ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کے افکار کے سرچشمے اور عمل کے محرکات فطری طور پر سفلی اور مادی ہیں، اس بنا پر وہ جب نیکی اور پرہیزگاری کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ درحقیقت ایک ملمع سازی ہوتی ہے کیونکہ یہ طرزِ عمل اُس کی اصل فطرت کے خلاف ہے اس لیے جو ضابطۂ حیات اُسے نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی دے وہی صحیح اور فطرتِ انسانی کے قریب ہے۔ اسلام کا اساسی تصورِ انسان کے بارے میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ انسان کو فطرت کے اعتبار سے نیک اور امین سمجھتا ہے اور اس اعتماد کے ساتھ انسان سے معاملہ کرتا ہے کہ اگر اُسے پاکیزہ ماحول اور اچھی تربیت میسر آجائے تو وہ شیطان بننے کے بجائے بندۂ رحمان ہو گا۔ اگر اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو یہ اس کی فطرت کا خاصہ نہیں بلکہ اتفاقی لغزش ہے جس کے ارتکاب سے اُس کے اندر خلش پیدا ہوتی ہے اور اس کا ضمیر بوجھ محسوس کرتا ہے۔ اس خلش کو محسوس کر کے وہ اپنی اصلاح کے لیے کوشش کرے تو وہ اپنے اخلاق کو زیادہ سے زیادہ بلندی تک لے جا سکتا ہے۔

انسان کے بارے میں ان دو مختلف نظریات کی وجہ سے جو اجتماعی نظام تشکیل پاتے ہیں وہ بھی بنیادی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً جو نظام انسان کو فطرت کے اعتبار سے نیک اور قابلِ اعتماد

سمجھتا ہے وہ اس کی فطرت اور اس کے مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوتا بلکہ برابر اصلاح کے لیے کوشاں رہتا ہے اور اصلاح کے معاملے میں بھی قانونی گرفت پر زیادہ انحصار کرنے کے بجائے تہذیبِ باطن اور تعلیم و تربیت پر زیادہ زور دیتا ہے، کیونکہ اندر کا انسان جب تک مہذب اور اخلاقی ضابطے کا پابند نہیں ہو جاتا خارجی پابندیاں زیادہ موثر ثابت نہیں ہو سکتیں۔ مگر جو لوگ انسان کو فطری طور پر گناہگار اور ناقابلِ اعتماد حیوان سمجھتے ہیں ان کا زیادہ زور قانونی جکڑ بندیوں اور بے رحم ضوابط پر ہوتا ہے اور وہ ان کی مدد سے ہی انسان کو اجتماعی زندگی کا پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کے فطری طور پر گنہگار ہونے کے تصوّر کی اگرچہ اسلام پوری طرح نفی کرتا ہے مگر بدقسمتی سے یہاں کے باشندوں کے ساتھ گزشتہ بیس سالوں میں جو سلوک کیا گیا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قومی معاملات کو چلانے والے اسی تصوّر کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو نظامِ تعلیم رائج ہے وہ مغرب کی بھونڈی نقالی ہے جس کے ذریعے ہماری نوجوان نسلیں مغربی افکار و نظریات کی تربیت پاتی ہیں اور وہ انسان کے بارے میں وہی عقیدہ لے کر جوان ہوتی ہیں جو اہلِ یورپ کا ہے کہ انسان محض ایک حیوان ہے اور اس کے لیے نفس و جسم کی خواہشات کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس تصوّر کی بنا پر انسان کو اجتماعی زندگی کا پابند بنانے کی صرف یہی ایک صورت ممکن سمجھی گئی ہے کہ ایک طرف تو اس کے لیے نپے تُلے چارے کا انتظام کیا جائے اور دوسری طرف سفلی جذبات کی تسکین کی اُسے پوری پوری آزادی مہیا کی جائے تاکہ وہ اس مادی زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔ چنانچہ شروع ہی سے ہمارے ہاں سیاسی اور معاشی میدان میں دو واضح رجحانات ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت سارے کام ڈنڈے کے زور سے کرے اور افراد کسی معاملے میں اپنے آپ پر کوئی ذمّہ داری محسوس نہ کریں۔ حکومت اگر لوگوں کی فلاح و بہبود کی متمنی ہے تو اُسے چاہیے کہ ملک کے اندر شدید قسم کی جکڑ بندیوں کے ذریعہ اس مقدس فرض کو سرانجام دے، کیونکہ اگر معاملہ انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تو وہ لازمی طور پر تخریبی کارروائیاں ہی کریں گے۔ دوسرے

ملک کے معاشی حالات کی بہتری کی بھی کوئی صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ ملک کے ذرائع و وسائل براہِ راست حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں اور وہ خود پیدائشِ دولت اور تقسیمِ دولت کا انتظام کرے، کیونکہ عام انسانی آبادی کو اگر اس معاملے میں آزادی دی گئی تو ملک میں منصفانہ تقسیمِ دولت کے بجائے چھین جھپٹ کا بازار گرم ہوگا اور کمزور طبقوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔

ہم اس وقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ یہ منطق کس قدر غلط ہے اور اس میں کیا کیا فکری لغزشیں ہیں اور یہ طرزِ استدلال جن مفروضات پر قائم ہے وہ کس قدر بودے اور حقیقت سے دُور ہیں۔ مثلاً یہ دعویٰ آخر کس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ وہی انسان جو اپنی انفرادی زندگی میں سخت حریص، لالچی اور بندۂ نفس ہوں گے انہیں جب اجتماعی نظام کو چلانے کے لیے اقتدار کی باگیں سونپ دی جائیں گی تو وہ انصاف اور بے غرضی کے پیکر بن جائیں گے اور اقتدار کا نشہ ان میں تکبّر اور خود غرضی پیدا کرنے کے بجائے انکسار اور بے نفسی کو جنم دے گا؟ ہم فی الحال ان سب پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کس قسم کے غلط رجحانات پیدا ہوگئے ہیں اور انھوں نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کس قسم کے تباہ کن نتائج مترتب کیے ہیں۔

ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر سب سے زبردست نقصان یہ پہنچا ہے کہ اسلام جو ہماری زندگی کی واحد اساس ہے وہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ گیا ہے۔ دو چار افراد فی ہزار کو چھوڑ کر پوری مسلم آبادی زبان سے تو یہی اقرار کرتی ہے کہ اسلام ہی صحیح اور مکمل ضابطۂ حیات ہے مگر اس زبانی اقرار کے باوجود ہم فلاح و کامرانی کے لیے دوسرے نظاموں کی طرف دیکھتے ہیں اور انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں ہماری زندگی میں جو یہ خوفناک تضاد پیدا ہوگیا ہے اس نے ہماری تعمیری قوتوں کو بالکل مفلوج کرکے رکھ دیا ہے اور اس سے ہمارے اندر نفاق کا ایسا مرض پیدا ہوگیا ہے جس کی اصلاح کی کوئی صورت بجز اس کے نظر نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ غیب سے اس کا کوئی انتظام کردے۔ اسلام کی مظلومیت کا یہ عالم ہے کہ خالص مادہ پرستانہ نظریات اور سو فیصد غیر اسلامی نظامہائے حیات کے علمبردار اسلام کے

نام پر اپنے ان خرافات کا پرچار کرتے پھرتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے نام پر اب کفر کی علانیہ اشاعت کی جا رہی ہے۔ یہ صورتِ حال اس قدر افسوسناک ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس منافقت کے ساتھ آج تک دنیا میں کسی قوم کو اُبھرنے بلکہ اُبھرنا تو کیا زندہ رہتے نہیں دیکھا گیا۔ یہ منافقت جب کسی قوم میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر اُسے دیمک کی طرح چاٹ لیتی ہے۔

دوسرا بڑا نقصان ہمیں یہ پہنچا ہے کہ ہماری قوم کے دل و دماغ میں یاس و قنوطیت چھا گئی ہے وہ اپنے آپ سے، اپنے ماضی سے، اپنی قیادت سے، اپنے مستقبل سے بیزار معلوم ہوتی ہے۔ اس چیز نے اس کے اندر نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں اور اُس کی خود اعتمادی کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ اُسے نہ تو اپنے آپ پر اعتماد باقی رہا ہے اور نہ کسی دوسرے پر اعتماد کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو آمادہ پاتی ہے۔ آپ کسی شخص سے بات کر کے دیکھیں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ ہر فرد یہاں بیزار بیٹھا ہے۔ عوام اس مرض کو معمولی سمجھتے ہیں حالانکہ اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ بڑا خوفناک مرض ہے جس سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ انسان دل لگا کر کوئی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہر کام کو بیگار سمجھ کرتا ہے، ہر دوسرے آدمی کو بے ایمان سمجھتے ہوئے اس سے معاملہ کرتا ہے اور خود بھی تخریب پسندانہ ذہنیت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ اُس کے اندر نہ کوئی تعمیری جذبہ باقی رہتا ہے نہ کوئی تعمیری قوت۔ اور دوسرا اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر فطری طور پر یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا اس کے لیے ہر کام کرے مگر وہ کسی کے لیے کچھ نہ کرے۔ یہی چیز اس کے اندر ایک آمرانہ نظام کی طلب اور اسے قبول کرنے کی کمزوری پیدا کر دیتی ہے، کیونکہ آمریت کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس کا دائرۂ اختیار بھی وسیع ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ صرف یہ وسیع اختیارات رکھنے والی طاقت ہی اُس کی زندگی کو بہتر اور شاد کام بنا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں آمرانہ مزاج رکھنے والے افراد کے جو اس قدر حوصلے بڑھے ہیں کہ وہ عوام کی منشا اور مرضی کے علی الرغم تختِ اقتدار

(باقی صہ ۶۳ پر)

تفہیم القرآن

الدَّھْر

نام اِس سورۃ کا نام "الدّہر" بھی ہے اور "الانسان" بھی۔ دونوں نام پہلی ہی آیت کے الفاظ ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ اور حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ سے ماخوذ ہیں۔

زمانۂ نزول اکثر مفسّرین اس کو مکی قرار دیتے ہیں۔ علامہ زمخشری، امام رازی، قاضی بیضاوی، علامہ نظام الدین نیسا پوری، حافظ ابن کثیر اور دوسرے بہت سے مفسّرین نے اسے مکی ہی لکھا ہے۔ اور علامہ آلوسی کہتے ہیں کہ یہی جمہور کا قول ہے۔ لیکن بعض دوسرے مفسّرین نے پوری سورۃ کو مدنی کہا ہے، اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سورۃ ہے تو مکی، مگر آیات ۸ تا ۱۰ مدینے میں نازل ہوئی ہیں۔

جہاں تک اس سورۃ کے مضامین اور اندازِ بیان کا تعلق ہے، وہ مدنی سورتوں کے مضامین اور انداز بیان سے بہت مختلف ہے، بلکہ اس پر غور کرنے سے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف مکی ہے بلکہ مکہ معظمہ کے بھی اُس دور میں نازل ہوئی ہے جو سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات کے بعد شروع ہوا تھا۔ رہیں آیات ۸ تا ۱۰ (وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ سے کر یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا تک)، تو وہ پوری سورۃ کے سلسلۂ بیان میں اس طرح پیوست ہیں کہ سیاق و سباق کے ساتھ کوئی اُن کو پڑھے تو ہرگز یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ ان سے پہلے اور بعد کا مضمون تو ۱۵، ۱۶ سال پہلے نازل ہوا تھا اور اس کے کئی سال بعد نازل ہونے والی یہ تین آیتیں یہاں لا کر ثبت

کر دی گئیں۔

دراصل جس بنا پر اس سُورۃ کے، یا اس کی بعض آیات کے مدنی ہونے کا خیال پیدا ہوا ہے، وہ ایک روایت ہے جو عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور بہت سے صحابہؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ بعض صحابہؓ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ آپ دونوں بچّوں کی شفا کے لیے اللہ تعالیٰ سے کوئی نذر مانیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی خادمہ فِضّہؓ نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے دونوں بچوں کو شفا عطا فرما دی تو وہ شکرانے کے طور پر تین دن کے روزے رکھیں گے۔ اللہ کا فضل ہُوا کہ دونوں تندرست ہو گئے اور تینوں صاحبوں نے نذر کے روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ حضرت علیؓ کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ انہوں نے تین صاع جَو قرض لیے (اور ایک روایت میں ہے کہ محنت مزدوری کر کے حاصل کیے)۔ پہلا روزہ کھول کر جب کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک مسکین نے کھانا مانگا۔ گھر والوں نے سارا کھانا اسے دے دیا اور خود پانی پی کر سو رہے۔ دوسرے دن پھر افطار کے لیے کھانے بیٹھے تو ایک یتیم آگیا اور اس نے سوال کیا۔ اُس روز بھی سارا کھانا انہوں نے اُس کو دے دیا اور پانی پی کر سو رہے۔ تیسرے دن روزہ کھول کر ابھی کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ ایک قیدی نے آکر وہی سوال کر دیا اور اُس روز کا بھی پُورا کھانا اسے دے دیا گیا۔ چوتھے روز حضرت علیؓ دونوں بچّوں کو لیے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے دیکھا کہ بھوک کی شدّت سے تینوں باپ بیٹوں کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ آپؐ اُٹھ کر اُن کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی ایک کونے میں بھوک سے نڈھال پڑی ہیں۔ یہ حال دیکھ کر حضورؐ پر رقّت طاری ہو گئی۔ اتنے میں جبریل علیہ السّلام حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ لیجیے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اہلِ بیت کے معاملہ میں آپ کو مبارک باد دی ہے۔ حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں یہ پوری سورۃ آپ کو

پڑھ کر سنائی (ابنِ مِہران کی روایت میں ہے کہ آیت اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ سے لیکر آخر تک کی آیات سنائیں ۔ اور ابن مَرْدُوْیَہ نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ . . . حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی ہے ، اِس قصّے کا اُس میں کوئی ذکر نہیں ہے) ۔ یہ پُورا قصّہ علی بن احمد الواحدی نے اپنی تفسیر البَسِیط میں بیان کیا ہے اور غالباً اُسی سے زَمَخشری ، رازی اور نَیسابوری نے اسے نقل کیا ہے ۔

یہ روایت اوّل تو سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے ۔ پھر درایت کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسکین ، ایک یتیم اور ایک قیدی اگر آکر کھانا مانگتا ہے تو گھر کے پانچوں افراد کا پُورا کھانا اس کو دے دینے کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے ؟ ایک آدمی کا کھانا اس کو دے کر گھر کے پانچ افراد چار آدمیوں کے کھانے پر اکتفا کر سکتے تھے ۔ پھر یہ بھی باور کرنا مشکل ہے کہ دو بچے جو ابھی بیماری سے اٹھے تھے اور کمزوری کی حالت میں تھے ، انہیں بھی تین دن بھوکا رکھنے کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ جیسی کامل فہمِ دین رکھنے والی ہستیوں نے نیکی کا کام سمجھا ہو گا ۔ اِس کے علاوہ قیدیوں کے معاملہ میں یہ طریقہ اسلامی حکومت کے دَور میں کبھی نہیں رہا کہ انہیں بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا جاتے ۔ وہ اگر حکومت کی قید میں ہوتے تو حکومت ان کی خوراک اور لباس کا انتظام کرتی تھی ، اور کسی شخص کے سپرد کیے جاتے تو وہ شخص انہیں کھلانے پلانے کا ذمّہ دار ہوتا تھا ۔ اس لیے مدینہ طیبہ میں یہ بات ممکن نہ تھی کہ کوئی قیدی بھیک مانگنے کے لیے نکلتا ۔ تاہم ان تمام نقلی اور عقلی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے اگر اس قصّے کو بالکل صحیح ہی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اِس سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نیک عمل کا صُدُور ہُوا تو جبریلؑ نے آکر حضورؐ کو خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کے اہلِ بیت کا یہ فعل بہت مقبول ہُوا ہے ، کیونکہ اُنہوں نے ٹھیک وہی پسندیدہ کام کیا ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے سُورۂ دہر

کی ان آیات میں فرمائی ہے۔ اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ آیات نازل بھی اسی موقع پر ہوئی نہیں۔ شانِ نزول کے بارے میں بہت سی روایات کا حال یہی ہے کہ کسی آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے تو دراصل اس سے مُراد یہ نہیں ہوتی کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اُسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اِس واقعہ پر ٹھیک چسپاں ہوتی ہے۔ امام سیُوطی نے اتقان میں حافظ ابن تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ " راوی جب یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہی معاملہ اس کے نزول کا سبب ہے، اور کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے اگرچہ وہ اس کے نزول کا سبب نہ ہو۔" آگے چل کر وہ امام بدرالدین زرکشی کا قول اُن کی کتاب البُرہان فی علوم القرآن سے نقل کرتے ہیں کہ "صحابہؓ اور تابعین کی یہ عادت معروف ہے کہ ان میں سے کوئی شخص جب یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اِس آیت کا حکم اِس معاملہ پر چسپاں ہوتا ہے، نہ یہ کہ وہی اِس واقعہ کے نزول کا سبب ہے۔ پس دراصل اُس کی نوعیت آیت کے حکم سے استدلال کی ہوتی ہے نہ کہ بیانِ واقعہ کی" (الاتقان فی علوم القرآن جلد اوّل، صفحہ ۳۱، طبع ۱۹۲۹ء)۔

موضوع اور مضمون | اِس سُورہ کا موضوع انسان کو دنیا میں اُس کی حقیقی حیثیت سے آگاہ کرنا اور یہ بتانا ہے کہ اگر وہ اپنی اس حیثیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر شکر کا رویہ اختیار کرے تو اس کا انجام کیا ہوگا اور کفر کی راہ چلے تو کس انجام سے وہ دوچار ہوگا۔ قرآن کی بڑی سُورتوں میں تو یہ مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لیکن ابتدائی مکی دور کی سُورتوں کا یہ خاص اندازِ بیان ہے کہ جو باتیں بعد کے دَور میں مفصّل ارشاد ہوئی ہیں وہی اِس دَور میں بڑے مختصر مگر انتہائی مؤثر طریقے سے ذہن نشین کرائی گئی ہیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت فقرے استعمال کیے گئے ہیں جو سُننے والوں کی زبان پر خودبخود

چڑھ جائیں۔

اِس میں سب سے پہلے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب وہ کچھ نہ تھا، پھر ایک مخلوط نطفے سے اس کی ایسی حقیر سی ابتدا کی گئی کہ اس کی ماں تک کو خبر نہ تھی کہ اس کے وجود کی بنا پڑ گئی ہے اور کوئی اُس خوردبینی وجود کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی انسان ہے جو آگے چل کر اِس زمین پر اشرف المخلوقات بننے والا ہے۔ اس کے بعد انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ تیری تخلیق اِس طرح کر کے تجھے یہ کچھ ہم نے اس لیے بنایا ہے کہ ہم دنیا میں رکھ کر تیرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے دوسری مخلوقات کے برعکس تجھے ہوش گوش رکھنے والا بنایا گیا اور تیرے سامنے شکر اور کُفر کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیئے گئے تاکہ یہاں کام کرنے کا جو وقت تجھے دیا گیا ہے اس میں تو دکھا دے کہ اس امتحان سے تو شاکر بندہ بن کر نکلا ہے یا کافر بندہ بن کر۔

پھر صرف ایک آیت میں دو ٹوک طریقہ سے بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ اِس امتحان سے کافر بن کر نکلیں گے اُنہیں آخرت میں کیا انجام دیکھنا ہوگا۔

اس کے بعد آیت نمبر ۵ سے ۲۲ تک مسلسل اُن انعامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے وہ لوگ اپنے رب کے ہاں نوازے جائیں گے جنہوں نے یہاں بندگی کا حق ادا کیا ہے۔ اِن آیات میں صرف اُن کی بہترین جزا بتانے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ مختصراً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اُن کے وہ کیا اعمال ہیں جن کی بنا پر وہ اِس جزا کے مستحق ہونگے۔ مکّی دور کی ابتدائی سورتوں کی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اسلام کے بنیادی عقائد اور تصورات کا مختصر تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ کہیں وہ اخلاقی اوصاف اور نیک اعمال بیان کیے گئے ہیں جو اسلام کی نگاہ میں قابلِ قدر ہیں، اور کہیں اعمال و اخلاق کی اُن برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اسلام انسان کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اس لحاظ سے بیان نہیں کی گئی ہیں کہ ان کا کیا اچھا یا بُرا نتیجہ

دنیا کی اِس عارضی زندگی میں نکلتا ہے، بلکہ صرف اِس حیثیت سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے کہ آخرت کی ابدی اور پائیدار زندگی میں اُن کا مستقل نتیجہ کیا ہوگا قطع نظر اس سے کہ دنیا میں کوئی بُری صفت مفید ہو یا کوئی اچھی صفت نقصان دہ ثابت ہو۔

یہ پہلے رکوع کا مضمون ہے۔ اس کے بعد دوسرے رکوع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ دراصل یہ ہم ہی ہیں جو اِس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کرکے تم پر نازل کر رہے ہیں، اور اس سے مقصود حضورؐ کو نہیں بلکہ کفار کو خبردار کرنا ہے کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دل سے نہیں گھڑ رہے ہیں بلکہ اس کے نازل کرنے والے ہم ہیں اور ہماری حکمت ہی اس کی مقتضی ہے کہ اسے یک بارگی نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کریں۔ دوسری بات حضورؐ سے یہ فرمائی گئی ہے کہ تمہارے ربّ کا فیصلہ صادر ہونے میں خواہ کتنی ہی دیر لگے، اور اس دوران میں تم پر خواہ کچھ ہی گزر جائے، بہرحال تم صبر کے ساتھ اپنا فریضۂ رسالت انجام دیتے چلے جاؤ اور کبھی اِن بدعمل اور منکرِ حق لوگوں میں سے کسی کے دباؤ میں نہ آؤ۔ تیسری بات آپ سے یہ فرمائی گئی ہے کہ شب و روز اللہ کو یاد کرو، نماز پڑھو اور راتیں اللہ کی عبادت میں گزارو، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس سے کفر کی طغیانی کے مقابلہ میں اللہ کی طرف بلانے والوں کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔

پھر ایک فقرے میں کفار کے غلط رویّے کی اصل وجہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آخرت کو بھول کر دنیا پر فریفتہ ہو گئے ہیں، اور دوسرے فقرے میں اُن کو متنبّہ کیا گیا ہے کہ تم خود نہیں بن گئے ہو، ہم نے تمہیں بنایا ہے، یہ چوڑے چکلے سینے اور مضبوط ہاتھ پاؤں تم نے خود اپنے لیے نہیں بنا لیے ہیں، ان کے بنانے والے بھی ہم ہی ہیں، اور یہ بات ہر وقت ہماری قدرت میں ہے کہ جو کچھ ہم تمہارے ساتھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ تمہاری شکلیں بگاڑ سکتے ہیں تمہیں ہلاک کرکے کوئی دوسری قوم تمہاری جگہ لا سکتے ہیں۔ تمہیں مار کر دوبارہ جس شکل میں چاہیں تمہیں پیدا کر سکتے ہیں۔

آخر میں کلام اِس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ یہ ایک کلمۂ نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر کے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔ مگر دنیا میں انسان کی چاہت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ کسی کی چاہت بھی پوری نہیں ہو سکتی جب تک اللہ نہ چاہے، اور اللہ کی چاہت اندھا دُھند نہیں ہے، وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے اپنے علم اور اپنی حکمت کی بنا پر چاہتا ہے۔ اِس علم اور حکمت کی بنا پر جسے وہ اپنی رحمت کا مستحق سمجھتا ہے اسے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے، اور جسے وہ ظالم پاتا ہے اس کے لیے دردناک عذاب کا انتظام اس نے کر رکھا ہے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا؟[1] ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا[2] تاکہ اس کا امتحان لیں[3] اور اِس غرض

[1] پہلا فقرہ ہے هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ۔ اکثر مفسّرین و مترجمین نے یہاں هَلْ کو قَدْ کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ بے شک یا بلاشبہ انسان پر ایسا ایک وقت آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ هَلْ عربی زبان میں "کیا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور اِس سے مقصود ہر حال میں سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ مختلف مواقع پر یہ بظاہر سوالیہ لفظ مختلف معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی تو ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں اور کسی سے پوچھتے ہیں "کیا یہ واقعہ پیش آیا ہے؟" کبھی ہمارا مقصود سوال کرنا نہیں ہوتا بلکہ کسی بات کا انکار کرنا ہوتا ہے اور یہ انکار ہم اس انداز میں کرتے ہیں کہ "کیا یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے؟" کبھی ہم ایک شخص سے کسی بات کا اقرار کرانا چاہتے ہیں اور اِس غرض کے لیے اس سے پوچھتے ہیں کہ "کیا مَیں نے تمہاری رقم ادا کر دی؟" اور کبھی ہمارا مقصود محض اقرار ہی کرانا نہیں ہوتا بلکہ سوال ہم اس غرض کے لیے کرتے ہیں کہ مخاطَب کے ذہن کو ایک اور بات سوچنے پر مجبور کر دیں جو لازماً اُس کے اقرار سے بطور نتیجہ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھتے ہیں "کیا مَیں نے تمہارے ساتھ کوئی بُرائی کی ہے؟" اس سے مقصود صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ آپ نے

اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے اس کے ساتھ میں برائی کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔ آیت زیر بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل اسی آخری معنی میں ارشاد ہوا ہے۔ اس سے مقصود انسان سے صرف یہی اقرار کرانا نہیں ہے کہ فی الواقع اُس پر ایک وقت ایسا گزرا ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہے کہ جس خدا نے اس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیر سی حالت سے کر کے اسے پُورا انسان بنا کھڑا کیا وہ آخر اسے دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز ہوگا؟

دوسرا فقرہ ہے حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ۔ دھر سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے نہ انتہا، اور حین سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ اس لامتناہی زمانے کے اندر ایک طویل مدت تو ایسی گزری ہے جب سرے سے نوعِ انسانی ہی موجود نہ تھی۔ پھر اُس میں ایک وقت ایسا آیا جب انسان نام کی ایک نوع کا آغاز کیا گیا۔ اور اسی زمانے کے اندر ہر شخص پر ایک ایسا وقت آیا ہے جب اسے عدم سے وجود میں لانے کی ابتدا کی گئی۔

تیسرا فقرہ ہے لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا، یعنی اس وقت وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ اُس کا ایک حصّہ باپ کے نُطفے میں ایک خوردبینی کیڑے کی شکل میں اور دوسرا حصّہ ماں کے نطفے میں ایک خوردبینی بیضے کی شکل میں موجود تھا۔ مدتہائے دراز تک تو انسان یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ دراصل وہ اِس کیڑے اور بیضے کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ اب طاقتور خوردبینوں سے اِن دونوں کو دیکھ تو لیا گیا ہے لیکن اب بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنا انسان باپ کے اِس کیڑے میں اور کتنا ماں کے اِس بیضے میں موجود ہوتا ہے۔ پھر استقرارِ حمل کے وقت اِن دونوں کے ملنے سے جو ابتدائی خَلِيَّه (CELL) وجود میں آتا ہے وہ ایک ایسا ذرّۂ بے مقدار ہوتا ہے کہ بہت طاقتور خوردبین ہی سے نظر آ سکتا ہے اور اسے دیکھ کر بھی بادی النظر میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی انسان بن رہا ہے، نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس حقیر سی ابتدا سے نشوونما پا کر کوئی انسان اگر بنے گا بھی تو وہ کس قد و قامت، کس شکل و صورت، کس قابلیت اور شخصیت

کا انسان ہوگا۔ یہی مطلب ہے اِس ارشاد کا کہ اُس وقت وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا اگرچہ انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے وجود کا آغاز ہو گیا تھا۔

۲؎ "ایک مخلوط نُطفے" سے مُراد یہ ہے کہ انسان کی پیدائش مرد اور عورت کے دو الگ الگ نطفوں سے نہیں ہوتی ہے بلکہ دونوں نطفے مل کر جب ایک ہو گئے تب اُس مُرکّب نطفے سے انسان پیدا ہوا۔

۳؎ یہ ہے دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی اصل حیثیت۔ وہ درختوں اور جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصدِ تخلیق یہیں پُورا ہو جائے اور قانونِ فطرت کے مطابق ایک مدت تک اپنے حصّے کا کام کر کے وہ یہیں مر کر فنا ہو جائے۔ نیز یہ دنیا اُس کے لیے نہ دارالعذاب ہے، جیسا کہ راہب سمجھتے ہیں، نہ دارالجزاء ہے جیسا کہ تناسُخ کے قائلین سمجھتے ہیں، نہ چراگاہ اور تفریح گاہ ہے، جیسا کہ مادہ پرست سمجھتے ہیں، اور نہ رزم گاہ، جیسا کہ ڈارون اور مارکس کے پیرو سمجھتے ہیں، بلکہ دراصل یہ اُس کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔ وہ جس چیز کو عمر سمجھتا ہے حقیقت میں وہ امتحان کا وقت ہے جو اُسے یہاں دیا گیا ہے۔ دنیا میں جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی اس کو دی گئی ہیں، جن چیزوں پر بھی اس کو تصرّف کے مواقع دیئے گئے ہیں، جن حیثیتوں میں بھی وہ یہاں کام کر رہا ہے، اور جو تعلقات بھی اُس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں، وہ سب اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں، اور زندگی کے آخری سانس تک اِس امتحان کا سلسلہ جاری ہے۔ نتیجہ اس کا دنیا میں نہیں نکلنا ہے بلکہ آخرت میں اُس کے تمام پرچوں کو جانچ کر یہ فیصلہ ہونا ہے کہ وہ کامیاب ہُوا ہے یا ناکام۔ اور اس کی کامیابی و ناکامی کا سارا انحصار اِس پر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہوئے یہاں کام کیا، اور کس طرح امتحان کے وہ پرچے کیے جو اسے یہاں دیئے گئے تھے۔ اگر اس نے اپنے آپ کو بے خدا یا بہت سے خداؤں کا بندہ سمجھا، اور سارے پرچے یہ سمجھتے ہوئے کیے کہ آخرت میں اسے اپنے خالق کے سامنے کوئی جوابدہی نہیں کرنی ہے، تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی غلط ہو گیا۔ اور اگر اس نے اپنے آپ کو خدائے واحد کا بندہ سمجھ کر اُس طریقے پر کام کیا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور آخرت کی جوابدہی کو پیشِ نظر رکھا تو وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ (یہ مضمون قرآن مجید میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی تفصیلات

کے لیے ہم نے اسے سُننے اور دیکھنے والا بنایا۔[۴] ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔[۵]

کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اُن سب مقامات کا حوالہ دینا یہاں مشکل ہے۔ جو حضرات اسے پُوری طرح سمجھنا چاہتے ہوں وہ تفہیم القرآن کی ہر جلد کے آخر میں فہرست موضوعات کے اندر لفظ "آزمائش" نکال کر وہ تمام مقامات دیکھ لیں جہاں قرآن میں مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں یہ حقیقت اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہو)۔

[۴] اصل میں فرمایا گیا ہے "ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا"۔ اِس کا مفہوم صحیح طور پر "ہوش گوش رکھنے والا بنایا" سے ادا ہوتا ہے، لیکن ہم نے ترجمے کی رعایت سے سمیع کے معنی "سننے والا" اور بصیر کے معنی "دیکھنے والا" کیے ہیں۔ اگرچہ عربی زبان کے اِن الفاظ کا لفظی ترجمہ یہی ہے مگر ہر عربی داں جانتا ہے کہ حیوان کے لیے سمیع اور بصیر کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے، حالانکہ وہ بھی سُننے اور دیکھنے والا ہوتا ہے۔ پس سُننے اور دیکھنے سے مراد یہاں سماعت اور بینائی کی وہ قوتیں نہیں ہیں جو حیوانات کو بھی دی گئی ہیں، بلکہ اس سے مُراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا اور پھر اس سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ علاوہ بریں سماعت اور بصارت انسان کے ذرائعِ علم میں چونکہ سب سے زیادہ اہم ہیں اس لیے اختصار کے طور پر صرف انہی کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اصل مراد انسان کو وہ تمام حواس عطا کرنا ہے جن کے ذریعہ سے وہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ پھر انسان کو جو حواس دیئے گئے ہیں وہ اپنی نوعیت میں اُن حواس سے بالکل مختلف ہیں جو حیوانات کو دیئے گئے ہیں کیونکہ اس کے ہر حاسہ کے پیچھے ایک سوچنے والا دماغ موجود ہوتا ہے جو حواس کے ذریعہ سے آنے والی معلومات کو جمع کرکے اور ان کو ترتیب دے کر اُن سے نتائج نکالتا ہے، رائے قائم کرتا ہے، اور پھر کچھ فیصلوں پر پہنچتا ہے جن پر اس کا رویۂ زندگی مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے کے بعد کہ انسان کو پیدا کرکے ہم اس کا امتحان لینا چاہتے تھے یہ ارشاد فرمانا کہ اِسی غرض کے لیے ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا، دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے علم اور عقل کی طاقتیں دیں تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر مقصودِ کلام یہ نہ ہو اور سمیع و بصیر بنانے کا مطلب

محض سماعت و بینائی کی قوتیں رکھنے والا ہی ہو تو ایک اندھا اور بہرا آدمی تو پھر امتحان سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے، حالانکہ جب تک کوئی علم و عقل سے بالکل محروم نہ ہو، امتحان سے اس کے مستثنیٰ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۵۔ یعنی ہم نے اسے محض علم و عقل کی قوتیں دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ شکر کا راستہ کونسا ہے اور کفر کا راستہ کونسا، اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہو۔ سورۂ بلد میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ "اور ہم نے اسے دونوں راستے (یعنی خیر و شر کے راستے) نمایاں کر کے بتا دیے"۔ اور سورۂ شمس میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّىٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَىٰهَا "اور قسم ہے (انسان کے) نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے (تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے ساتھ) اُستوار کیا، پھر اُس کا فجور اور اُس کا تقویٰ دونوں اُس پر الہام کر دیے"۔ ان تمام تصریحات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے، اور ساتھ ساتھ قرآن مجید کے اُن تفصیلی بیانات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دنیا میں کیا کیا انتظامات کیے ہیں، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں "راستہ دکھانے" سے مراد رہنمائی کی کوئی ایک ہی صورت نہیں ہے بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

(۱) ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اخلاقی حس بھی دی گئی ہے جس کی بدولت وہ فطری طور پر بھلائی اور برائی میں امتیاز کرتا ہے، بعض افعال اور اوصاف کو برا جانتا ہے اگرچہ وہ خود ان میں مبتلا ہو، اور بعض افعال و اوصاف کو اچھا جانتا ہے اگرچہ وہ خود اُن سے اجتناب کر رہا ہو۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے اپنی اغراض و خواہشات کی خاطر ایسے فلسفے گھڑ لیے ہیں جن کی بنا پر بہت سی برائیوں کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا ہے، ان کا حال بھی یہ ہے کہ وہی برائیاں اگر کوئی دوسرا ان کے ساتھ کرے تو وہ اُس پر چیخ اُٹھتے ہیں اور اُس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے جھوٹے فلسفوں کے باوجود حقیقت میں وہ اُن کو برا ہی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح نیک اعمال و اوصاف کو خواہ کسی نے جہالت

اور حماقت اور دقیانوسیت ہی قرار دے رکھا ہو، لیکن جب کسی انسان سے خود اُس کی ذات کو کسی نیک سلوک کا فائدہ پہنچتا ہے تو اس کی فطرت اُسے قابلِ قدر سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(۲) ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ضمیر (نفسِ لوّامہ) نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو اسے ہر اُس موقع پر ٹوکتی ہے جب وہ کوئی بُرائی کرنے والا ہو یا کر رہا ہو یا کر چکا ہو۔ اِس ضمیر کو خواہ انسان کتنی ہی تھپکیاں دے کر سُلائے، اور اس کو بے حس بنانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کر لے، لیکن وہ اسے بالکل فنا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ وہ دنیا میں ڈھیٹ بن کر اپنے آپ کو قطعی بے ضمیر ثابت کر سکتا ہے، وہ حجتیں بگھار کر دنیا کو دھوکا دینے کی بھی ہر کوشش کر سکتا ہے، وہ اپنے نفس کو بھی فریب دینے کے لیے اپنے افعال کے لیے بے شمار عذرات تراش سکتا ہے، مگر اس کے باوجود اللہ نے اس کی فطرت میں جو مُحاسِب بٹھا رکھا ہے وہ اتنا جاندار ہے کہ کسی بُرے انسان سے یہ بات چھُپی نہیں رہتی کہ وہ حقیقت میں کیا ہے۔ یہی بات ہے جو سورۂ قیامہ میں فرمائی گئی ہے کہ "انسان خود اپنے آپ کو خوب جانتا ہے خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے" (آیت ۱۵)۔

(۳) انسان کے اپنے وجود میں اور اُس کے گردوپیش زمین سے لیکر آسمان تک ساری کائنات میں ہر طرف ایسی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو خبر دے رہی ہیں کہ یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر نہیں ہو سکتا، نہ بہت سے خدا اِس کارخانۂ ہستی کے بنانے والے اور چلانے والے ہو سکتے ہیں۔ اِسی طرح آفاق اور اَنفُس کی یہی نشانیاں قیامت اور آخرت پر بھی صریح دلالت کر رہی ہیں۔ انسان اگر اِن سے آنکھیں بند کر لے، یا اپنی عقل سے کام لے کر اِن پر غور نہ کرے، یا جن حقائق کی نشان دہی یہ کر رہی ہیں اُن کو تسلیم کرنے سے جی چُرائے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تو حقیقت کی خبر دینے والے نشانات اس کے سامنے رکھ دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

(۴) انسان کی اپنی زندگی میں، اُس کی ہم عصر دنیا میں، اور اس سے پہلے گزری ہوئی تاریخ کے تجربات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں اور آتے رہے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک بالاتر حکومت اُس پر اور ساری کائنات پر فرمانروائی کر رہی ہے، جس کے آگے وہ بالکل بے بس ہے، جس کی

مشیت ہر چیز پر غالب ہے، اور جس کی مدد کا وہ محتاج ہے۔ یہ تجربات و مشاہدات صرف خارج ہی میں اِس حقیقت کی خبر دینے والے نہیں ہیں، بلکہ انسان کی اپنی فطرت میں بھی اُس بالاتر حکومت کے وجود کی شہادت موجود ہے جس کی بنا پر بڑے سے بڑا دہریہ بھی بُرا وقت آنے پر خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے، اور سخت سے سخت مشرک بھی سارے جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔

(۵) انسان کی عقل اور اس کی فطرت قطعی طور پر حکم لگاتی ہے کہ جُرم کی سزا اور عمدہ خدمات کا صلہ ملنا ضروری ہے۔ اِسی بنا پر تو دنیا کے ہر معاشرے میں عدالت کا نظام کسی نہ کسی صورت میں قائم کیا جاتا ہے اور جن خدمات کو قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے ان کا صلہ دینے کی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اخلاق اور قانونِ مکافات کے درمیان ایک ایسا لازمی تعلق ہے جس سے انکار کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب اگر یہ مسلّم ہے کہ اِس دنیا میں بے شمار جرائم ایسے ہیں جن کی پُوری سزا تو درکنار سرے سے کوئی سزا ہی نہیں دی جا سکتی، اور بے شمار خدمات بھی ایسی ہیں جن کا پورا صلہ تو کیا، کوئی صلہ بھی خدمت کرنے والے کو نہیں مل سکتا، تو آخرت کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ کوئی بے وقوف یہ فرض کر لے، یا کوئی ہٹ دھرم یہ رائے قائم کرنے پر اصرار کرے کہ انصاف کا تصور رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہو گیا ہے جو بجائے خود انصاف کے تصور سے خالی ہے۔ اور پھر اس سوال کا جواب اُس کے ذمہ رہ جاتا ہے کہ ایسی دنیا میں پیدا ہونے والے انسان کے اندر یہ انصاف کا تصور آخر آ کہاں سے گیا؟

(۶) اِن تمام ذرائع رہنمائی کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی صریح اور واضح رہنمائی کے لیے دنیا میں انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل کیں جن میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ شکر کی راہ کونسی ہے اور کُفر کی راہ کونسی، اور ان دونوں راہوں پر چلنے کے نتائج کیا ہیں۔ انبیاء اور کتابوں کی لائی ہوئی یہ تعلیمات بے شمار محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اتنے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں پھیلی ہیں کہ کوئی انسانی آبادی بھی خدا کے تصوّر، آخرت کے تصوّر، نیکی اور بدی کے فرق، اور اُن کے پیش کردہ اخلاقی اصولوں اور قانونی احکام سے ناواقف نہیں رہ گئی ہے، خواہ اسے یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ علم اسے انبیاء اور کتابوں کی لائی ہوئی

کُفر کرنے والوں کے لیے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔
نیک لوگ[۶] (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پئیں گے جن میں آبِ کافور کی آمیزش ہوگی، یہ ایک بہتا چشمہ ہوگا[۷] جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے[۸] شراب پئیں گے اور جہاں چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں نکال لیں گے[۹]۔

تعلیمات ہی سے حاصل ہوا ہے۔ آج جو لوگ انبیاء اور کتابوں کے منکر ہیں، یا ان سے بالکل بے خبر ہیں، وہ بھی اُن بہت سی چیزوں کی پیروی کر رہے ہیں جو دراصل اُنہی کی تعلیمات سے چھن چھن کر اُن تک پہنچی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ اِن چیزوں کا اصل ماخذ کونسا ہے۔

۶۔ اصل میں لفظ ابرار استعمال ہوا ہے جس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی اطاعت کا حق ادا کیا ہو، اس کے عائد کیے ہوئے فرائض بجالائے ہوں، اور اس کے منع کیے ہوئے افعال سے اجتناب کیا ہو۔

۷۔ یعنی وہ کافور ملا ہوا پانی نہ ہوگا بلکہ ایک ایسا قدرتی چشمہ ہوگا جس کے پانی کی صفائی اور ٹھنڈک اور خوشبو کافور سے ملتی جلتی ہوگی۔

۸۔ عباد اللہ (اللہ کے بندے)، یا عباد الرحمٰن (رحمٰن کے بندے)، کے الفاظ اگرچہ لغوی طور پر تمام انسانوں کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں، کیونکہ سب ہی خدا کے بندے ہیں، لیکن قرآن میں جہاں بھی یہ الفاظ آتے ہیں ان سے نیک بندے ہی مراد ہیں۔ گویا کہ بدلوگ جنہوں نے اپنے آپ کو بندگی سے خارج کر رکھا ہے، اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ اپنے اسمِ گرامی کی طرف منسوب کرتے ہوئے عباد اللہ یا عباد الرحمٰن کے معزز خطاب سے نوازے۔

۹۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں وہ کدال پھاوڑے لیکر نالیاں کھودیں گے اور اس طرح اس چشمے کا پانی جہاں لے جانا چاہیں گے لے جائیں گے، بلکہ ان کا ایک حکم اور اشارہ اس کے لیے کافی ہوگا کہ جنت میں جہاں وہ چاہیں اُسی جگہ وہ چشمہ پھوٹ بہے۔ بسہولت نکال لینے کے الفاظ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

فقر و فاقہ اور اس کا اسلامی حل

از: یوسف القرضاوی ـــــ ترجمہ و تلخیص :- عبدالحمید صدیقی

(۷)

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی سزا دُنیا اور آخرت میں | اسلام نے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کو دنیا و آخرت میں سخت سزا کی وعید فرمائی ہے ۔ آخرت کی سزا کے بارے میں ارشادِ خداوندی ملاحظہ ہو۔ سیم و زر جمع کرنے اور اس میں سے خدا کا حق (زکوٰۃ) ادا نہ کرنے والوں کو دھمکی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَ ظُھُوْرُھُمْ۔ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ۔

(توبہ : ۳۴-۳۵)

دردناک سزا کی خوش خبری دو ان لوگوں کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا ـــ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا۔ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزا چکھو۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا " جسے اللہ نے مال دیا ہو اور وہ اُس کی زکوٰۃ نہ دے اُس کے لیے اس کا مال قیامت کے دن ایک گنجے سانپ کی شکل میں پیش کیا جائے گا جس کے زہر بھرے منکے ہوں گے ۔ اس سانپ کو اس آدمی کے گلے کا طوق بنایا جائیگا

پھر وہ اس کے دونوں جبڑوں کو ڈسے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، میں تیرا اندوختہ ہوں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (آل عمران: ۱۸۰)

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق بن جائیگا۔

دنیوی سزا کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "جب بھی لوگوں نے زکوٰۃ دینی چھوڑی اللہ تعالیٰ نے ان کو بھوک اور قحط میں مبتلا کر دیا" ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ "جب بھی کسی قوم نے اپنے مالوں کی زکوٰۃ دینی بند کی ان پر آسمان سے بارانِ رحمت کو روک دیا گیا۔ اگر چوپائے نہ ہوں تو ان پر کبھی بارش نہ برسائی جاتے" ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ "صدقہ یا زکوٰۃ جب بھی کسی مال میں شامل ہوتا ہے وہ اس مال کو خراب کر دیتا ہے" مطلب یہ ہے کہ اگر مال میں سے زکوٰۃ نہ نکالی جاتے اور وہ اسی میں شامل رہے تو یہ رکی ہوئی زکوٰۃ اس مال کو تباہ کر دیتی ہے

یہ سب کچھ تو اس تکوینی اور تقدیری سزا کے بارے میں ہے جو کائنات اور تقدیر کے مالک کی طرف سے ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور دنیوی سزا ہے جسے شرعی اور قانونی سزا کہتے ہیں اور جس کا نافذ کرنا اسلامی معاشرے میں اُولوالامر کے ذمہ ہے۔ اس سزا کے ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث زکوٰۃ کے بارے میں یوں آتی ہے کہ "جس نے اجر و ثواب کی نیت سے اسے ادا کیا اس کے لیے اس کا اجر ہے اور جو اسے ادا نہیں کرتا ہم اس سے زکوٰۃ بھی وصول کریں گے اور اس کا آدھا مال بھی لے لیں گے جو ہمارے رب کی طرف سے عائد کردہ تاوان ہو گا اور جس میں سے آلِ محمدؐ کے لیے کوئی چیز جائز نہیں"

اس حدیث کی رو سے اولوالامر کے لیے جائز ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کے آدھے مال کو

بحقِ سرکار ضبط کرلے۔ یہ ایک قسم کی مالی سزا ہے جسے حاکم بوقتِ ضرورت دے سکتا ہے تاکہ وہ زکوٰۃ چوروں کو سیدھا کر سکے۔ یہ سزا کوئی لازمی اور دائمی سزا نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی تنبیہی سزا ہے جو مسلم سوسائٹی کے اولوالامر اور اربابِ حل وعقد کی صواب دید اور اجتہاد کے تابع ہوتی ہے جبکہ وہ زکوٰۃ نہ دینے والوں کا دماغ درست کرنے کے لیے اس کی ضرورت محسوس کریں۔ نیز اولوالامر کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ حسبِ مصلحت و ضرورت ایسے لوگوں کو جسمانی اور قید و بند کی سزا بھی دیں۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ اسلام سرکش مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف، جبکہ انہوں نے کوئی جتھا بنا لیا ہو، تلوار سونتنے اور اعلانِ جنگ کرنے کو بھی جائز رکھتا ہے۔ چنانچہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف باقاعدہ جنگ کی تھی۔ اس موقع پر آپؓ نے یہ مشہور کلمات فرمائے تھے واللہ لاقاتلنّ من فرّق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ، فان الزکوٰۃ حق المال، واللہ لئن منعونی عقالا کانوا یؤدّونہ لرسول اللہ لقاتلتہم علیہ۔ (خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے جنگ کروں گا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ خدا کی قسم اگر انہوں نے مجھے ایک عقال بھی نہ دی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر اُن سے جنگ کروں گا۔)

علامہ ابنِ حزم فرماتے ہیں کہ "زکوٰۃ نہ دینے والے کے متعلق حکم یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ لی جائے قطعِ نظر اس سے کہ وہ اسے دینا چاہے یا نہ۔ کیونکہ اگر وہ زکوٰۃ نہیں دے رہا تو وہ گویا اسلامی نظام کے خلاف برسرِ جنگ ہے، اور اگر وہ سرے سے زکوٰۃ کی فرضیت ہی سے انکار کر رہا ہے تو وہ مرتد ہے؛ اور اگر وہ اُسے چھپا رہا ہے تو وہ ایک جرم کا ارتکاب کر رہا ہے، لہٰذا اُس کو سزا دینا یا اُسے مارنا حکومتِ وقت پر واجب ہے یہاں تک کہ وہ زکوٰۃ لے آئے یا مر کر ہمیشہ کے لیے خدا تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار کا مستحق بن جائے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص بھی کسی منکر کا ارتکاب ہوتا دیکھے تو اگر اس میں طاقت ہو تو اُسے اپنے ہاتھ سے روک دے پس چونکہ

---

[1] بخاری و مسلم۔

زکوٰۃ کا ادا نہ کرنا بھی ایک منکر ہے اس لیے اسے روکنا ہر صاحبِ قوت و اقتدار پر فرض ہے"۔

زکوٰۃ کی اہمیت | مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ زکوٰۃ کس اونچے درجے کا واجب ہے۔ یہ کوئی معمولی واجب نہیں بلکہ جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں واضح کر چکے ہیں یہ اُن پانچ ستونوں میں سے ایک ہے جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے اور یہ معلوم ہے کہ زکوٰۃ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے۔ اسے ہر خاص و عام نے نقل کیا ہے اور اس کی فرضیت دلیل کی محتاج نہیں۔ کیونکہ یہ آیاتِ قرآنی سے بہ تکرار، سُنّتِ نبویؐ سے بالتواتر اور ساری امّت کے اسلاف و اخلاف سے بالاجماع قطعی طور پر ثابت ہے۔

بعض محقق علماء کا کہنا ہے کہ عقلِ انسانی بھی زکوٰۃ کی فرضیت پر اسی طرح دلالت کرتی ہے جس طرح کہ قرآن و سنّت اور اجماعِ امّت کرتے ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:-

(۱) زکوٰۃ ادا کرنا اس وجہ سے واجب ہے کہ کمزور کی اعانت ہو، بے زر کی مدد کی جائے، اور یہ کسی عاجز اور درماندہ شخص کو اس پر قادر کر دے کہ وہ اللہ کی طرف سے فرض کردہ چیزوں یعنی توحید اور عبادات کو ادا کر سکے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ کسی فرض چیز کو ادا کرنے کا ذریعہ بھی فرض ہوتا ہے۔

(۲) زکوٰۃ اس شخص کو گناہوں کی نجاستوں سے پاک کر دیتی ہے جو اُسے ادا کرتا ہے اور اس کے اخلاق کو پاکیزہ کرکے اس میں جود و کرم اور ترکِ حرص و آز کی خوبیاں پیدا کر دیتی ہے۔ وہ دل جو فطرتاً مال و دولت کا حریص ہوتا ہے زکوٰۃ ادا کرنے سے فیاضی اور سخاوت کا عادی بن جاتا ہے اور امانتوں کے ادا کرنے اور مستحق لوگوں تک ان کے حقوق پہنچانے کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں یہ سب چیزیں شامل ہیں: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (التوبہ ۱۰۳) "ان کے مالوں میں سے ایک مقدار صدقہ کی وصول کرکے ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو"۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے اہلِ ثروت کو دولتمند بنا کر اُن پر اپنا انعام کیا ہے اور مختلف نعمتیں اور ان کی اصلی ضروریات سے زاید مال دے کر انہیں خاص طور پر فضیلت بخشی ہے۔ وہ نازو نعمت میں بڑی

شاندار زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور نعمت کا شکر ادا کرنا عقلی اور شرعی دونوں اعتبار سے فرض ہے۔ زکوٰۃ کا ادا کرنا ایک طرح کا شکرانِ نعمت ہے لہٰذا فرض ہے۔

اسلام کے احکام و ضوابط میں فریضۂ زکوٰۃ کا جو مقام ہے اس کے پیشِ نظر ہی علماء نے کہا ہے کہ جو شخص زکوٰۃ ادا نہ کرے اور اس کے وجوب کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ اور وہ اسلام سے اس طرح نکل جاتا ہے جیسے کمان سے تیر۔

ابنِ قدامہ فرماتے ہیں" جو شخص بربنائے جہالت زکوٰۃ کے وجوب کا منکر ہو، اس کی اس لاعلمی کا سبب خواہ یہ ہو کہ وہ نیا نیا مسلمان ہوا ہے یا وہ شہروں سے دور کہیں جنگلوں میں پلا بڑھا ہو، بعد میں اُسے زکوٰۃ کے وجوب کا پتا چلے تو اُسے کافر نہیں کہا جائے گا کیونکہ وہ معذور رہے۔ لیکن اگر زکوٰۃ کے وجوب کا منکر مسلمان ہو اور کسی اسلامی ملک میں اہلِ علم کے درمیان رہتا ہو تو وہ مرتد ہو گا۔ اس پر مرتدین کے سے احکام لاگو ہوں گے۔ اُسے تین مرتبہ توبہ کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اگر وہ توبہ کرلے تو چھوڑ دیا جائے گا ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ وجوبِ زکوٰۃ کے دلائل قرآن و سنّت اور اجماعِ امت سے بالکل واضح ہیں۔ جس شخص کا حال یہ ہو کہ وہ اسلامی ملک میں اہلِ علم کے درمیان رہتا ہو اُس سے قرآن و سنت کے یہ دلائل مخفی نہیں رہ سکتے۔ اگر وہ وجوبِ زکوٰۃ کا انکار کرتا ہے تو وہ کتاب و سنّت کی تکذیب کرتا ہے اور اُن دونوں کی حقانیت سے انکار کرتا ہے[۱]"

زکوٰۃ ایک مقررہ حق ہے اسلام میں زکوٰۃ ایک حق ہے یا امیر لوگوں کی گردنوں پر کمزور اور مستحق طبقوں کا قرضہ ہے۔ یوں وہ ایک مقررہ حق ہے یعنی اُس کی شرح اور مقدار مقرر ہے جسے وہ لوگ بھی جانتے ہیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے اور وہ بھی جانتے ہیں جن پر زکوٰۃ خرچ کی جاتی ہے۔ اس حق کو مقرر کرنے والی وہ ذات ہے جس نے اپنے پرہیزگار اور نیکوکار بندوں کے بارے میں فرمایا ہے: وَفِيٓ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُومِ (اُن کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے)۔ اور ایک دوسری سورۃ میں جنت میں عزت و تکریم کے مستحق نیک بندوں کے بارے میں فرمانِ خداوندی

---

[۱] المغنی جلد ۲۔ طبع ثالث المنار۔

ہے: وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (وہ لوگ کہ جن کے مالوں میں سائل اور نادار کا ایک مقرر حق ہے)۔

اس حق کا تقرر و تعین کوئی تعجب خیز نہیں جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مال پر انسان کی ملکیت کی حقیقت کیا ہے۔ اسلام کے اس نظریے کو نظریۂ استخلاف کہتے ہیں جس پر قرآن مجید کی مندرجۂ ذیل آیت اور اس طرح کی دوسری بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں:

وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ (الحدید ۷) اور خرچ کرو اس مال میں سے جس میں ہم نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان مال کا حقیقی مالک نہیں ہے۔ وہ تو مال کے حقیقی مالک، خالق اور رازق کی طرف سے مال کا امانت دار ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اس خالق و رازق کے فرمان کے آگے سرِ تسلیم خم کردے۔ اور اس حق کو مان لے جو مال کے حقیقی مالک نے تھوڑا یا زیادہ مقرر کیا ہے۔

جب زکوٰۃ ایک مقررہ حق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقراء، مساکین اور دیگر مستحق لوگوں کے لیے معاشرے کے اہلِ ثروت پر واجب قرار دیا ہے تو پھر یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ سال یا اس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ساقط نہ کیا جائے بلکہ اسے ادا کیا جائے اور اس کو مستحقین تک پہنچایا جائے۔ اس ضمن میں امام ابنِ حزم فرماتے ہیں: "جس کے مال میں دو یا اس سے زائد زکوٰتیں جمع ہو گئی ہوں اور وہ زندہ ہو تو جتنی زکوٰۃ اس پر ہر سال واجب ہوتی تھی، اُس حساب سے سارے سالوں کی زکوٰۃ اُس سے وصول کی جائیگی خواہ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کا سبب یہ ہو کہ اُس نے اپنا مال چھپا لیا ہو، یا حکومت کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے والا اہلکار اُس کے پاس نہ پہنچا ہو، یا بربنائے لاعلمی زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کا مرتکب ہو گیا ہو۔ یہ زکوٰۃ نقدی، کھیتی باڑی اور ڈھور ڈنگر سب پر پڑے گی خواہ اُس کے سارے مال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو یا نہ، یا زکوٰۃ کی وصولی کے بعد اُس کا مال نصاب سے کم ہو جائے۔ اور قرضخواہ کچھ نہیں لیں گے جب تک کہ پوری زکوٰۃ ادا نہ کر دی جائے"[1]۔

---

[1] محلّٰی ابنِ حزم، جلد ۶، ص ۸۷۔

حکومتیں جو ٹیکس وصول کرتی ہیں وہ اگر کافی مدت تک ادا نہ کیا جائے تو ساقط ہو جاتا ہے یا اگر اس پر چند سال گزر جائیں تو وہ کم یا زیادہ ہو جاتا ہے۔ مگر زکوٰۃ مسلمان پر ایک قرض کی طرح باقی رہتی ہے وہ جب تک اُسے ادا نہ کر دے، اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا اسلام اور ایمان صحیح و صادق نہیں ہو سکتا۔ اور وہ جیسا کہ علامہ ابن حزم کا خیال ہے، اپنی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے دوسرے سارے قرضوں سے ممتاز و مقدم ہے۔ وہ اللہ کا حق ہے۔ محتاج کا حق ہے اور ساری سوسائٹی کا حق ہے۔

اسی طرح کسی مالدار کے مرجانے سے اس کے مال پر سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہو جاتی اور باوجود اس کے کہ اُس نے وصیت نہ کی ہو، زکوٰۃ اس کے ترکے سے نکال لی جائے گی۔ عطاء، حسن، زہری، قتادہ، مالک، شافعی، احمد، اسحٰق، ابُوثور، اور ابنِ منذر اسی کے قائل ہیں۔ یہ بات ہے بھی صحیح کیونکہ یہ اُس فرمانِ خداوندی سے مطابقت رکھتی ہے جو مواریث کے بارے میں قرآنِ مجید میں وارد ہے: مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِىْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ (النساء-۱۲) وراثت اس وقت تقسیم کی جائے گی جبکہ وصیت جو کی گئی وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو میّت کے ذمّہ ہو ادا کر دیا جائے۔ اِس فرمانِ خداوندی میں سب قرضے شامل ہیں۔ اور زکوٰۃ علامہ ابنِ حزم کے بقول ایک قسم کا قرضہ ہے جو نصِّ قرآنی کے مطابق اللہ، مساکین، فقراء اور ان لوگوں کے لیے ہے جن کے ذمّے کوئی تاوان ہو۔ علامہ ابنِ حزم نے زکوٰۃ کے قرض کو دوسرے سارے قرضوں سے مقدم رکھنے میں مسلم کی مندرجۂ ذیل حدیث سے استدلال کیا ہے: ابنِ عباس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میری ماں مر گئی ہے درآنحالیکہ اس پر ایک ماہ کے روزے واجب تھے۔ کیا میں اُس کی طرف سے یہ قرض ادا کر سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: "اگر تمہاری ماں پر کوئی قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا کرتے؟" اُس نے کہا: "ہاں" تو آپؐ نے فرمایا "اللہ کا قرض اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اُسے ادا کیا جائے"۔

اس سے واضح ہوا کہ مکلّفِ زکوٰۃ کی موت زکوٰۃ کو اس سے ساقط نہیں کر دیتی اگرچہ اس کی موت اس طرح ہوئی ہو کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو کر شہید ہو گیا ہو۔ مسلم میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سوائے قرض کے شہید کے سب گناہ

معاف کر دیئے جاتے ہیں"۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص زکوٰۃ کے قرض کی ادائیگی میں دیر کرتا جائے حتیٰ کہ وہ راہِ خدا میں شہید ہو جائے تو ابن تیمیہؒ وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ زکوٰۃ سے بری الذمہ نہیں ہوگا۔

معلوم ہوا کہ اسلام میں زکوٰۃ ایک ثابت شدہ حق ہے جو ایک عرصہ تک ادا نہ کیا جائے یا جس پر اس کا ادا کرنا فرض ہو اُسے موت آجائے تو یہ حق ساقط نہیں ہوگا بلکہ یہ مرنے والے کے ترکے سے وصول کر لی جائیگی اور یہ حق دوسرے ہر حق یا قرض پر مقدم سمجھا جائے گا۔ یوں اسلام دَورِ حاضر کے قوانین دربارۂ ٹیکس سے سبقت لے گیا ہے جو خزانۂ عامرہ کو مقروض کے مال پر ایک خاص اختیار دیتے ہیں جو اُسے دوسرے قرضخواہوں پر مقدم رکھتا ہے اور جس کی رُو سے اگر مقروض اپنے مال میں کسی قسم کا تصرّف کرنے کی کوشش کرے تو خزانۂ عامرہ اس میں اپنی مرضی سے کام لے سکتا ہے۔

اشتراکی طریقِ کار اور زکوٰۃ کا فرق | اسلام کے مطابق زکوٰۃ کی ماہیت و مزاج یہ ہے کہ وہ ایک "حقِ معلوم" ہے اور جس ذات نے اس حق کو مقرر و متعین فرمایا ہے وہ خود اللہ تعالیٰ ہے جو انسان کا پیدا کرنے والا اور مال کا عطا کرنے والا ہے۔ جب اشتراکیت کے علمبردار فقرہ و فاقہ کے مسئلے کو اٹھاتے ہیں تو وہ حدِ اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں اور فساد و فتنہ برپا کرتے ہیں۔ وہ غریب سے کہتے ہیں کہ "تجھے لوٹ لیا گیا ہے اور تجھے لوٹنے والا امیر ہے"۔ پھر وہ غریب کو دولت کا لالچ دے کر بھڑکاتے ہیں اور فساد برپا کرکے امیروں کا سارا مال چھین لیتے ہیں۔ حالانکہ امرِ واقع یہ ہے کہ ہر غریب ایسا نہیں جسے لُوٹ لیا گیا ہے اور ہر امیر لٹیرا یا چور نہیں، اور ہر فقیر کا قصور امیر کے ذمّے نہیں ڈالا جا سکتا۔ غریبوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اپنی غربت کے خود ذمّہ دار ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جن تک اعتدال پسندوں کے نظریات پہنچے ہیں اور وہ بقول ڈاکٹر ابراہیم سلامہ اسلامی اصولوں اور قوانین کے تقریباً نزدیک آگئے ہیں مگر ابھی اُن تک پہنچے نہیں ہیں[1]۔ اشتراکیت کے علمبردار کہتے ہیں "امیر اور غریب کے مابین ایک تخمینی معاہدہ (APPROXIMATE CONTRACT) ہوتا ہے۔ وہ کسی کاغذ کے پُرزے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا بلکہ اشیاء کی ماہیت میں لکھا

---

[1] دین و اخلاق از ڈاکٹر محمد ابراہیم سلامہ۔ باب الفرادی و اجتماعی اخلاق۔

ہوتا ہے۔ غریب آدمی کام کرتا ہے اور امیر آدمی کماتا ہے۔ امیر کی کمائی غریب کے کام کی وجہ سے ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح متعلق ہیں جس طرح سرمایہ اور محنت لازم ملزوم ہیں۔ اور جب نظام اجتماعی ایسا ہو کہ اس میں غریب اور امیر کے درمیان اتنا عظیم فرق وامتیاز ہو تو چونکہ امیر کے ذمے غریب کا ایک قسم کا قرض ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے اس لیے جب غریب کو اس کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے مقروض کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔"

بادی النظر میں اس نظریے میں کچھ باتیں درست بھی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر درحقیقت یہ نظریہ گمراہ کن اور غریب کے سینے میں امیر کے خلاف غیظ و غضب کی آگ بھڑکانے والا ہے۔ اور اس میں امیر کے لیے یہ دھمکی موجود ہے کہ اس فرضی معاہدے کے نام پر اس کا مال بزور لے لیا جائے گا۔ اسلام کے نقطۂ نظر اور اس ظن و تخمین پر مبنی غیر اسلامی نظریے کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر حقیقت اور انصاف پر مبنی ہے اور یہ دوسرا نقطۂ نظر غصے اور بے اعتدالی پر۔

اسلامی نظریہ میں غریب کا اس حد تک مقرر و ثابت ہے کہ اسے "حق" کہا گیا ہے، معاہدہ نہیں کہا گیا۔ اسلام میں یہ حق معلوم" ہے، غیر معلوم اور فرضی نہیں ہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کو حقوق اللہ میں سے بھی ایک حق قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ ایک انسان کا اپنے بھائی پر حق ہے۔ اللہ کا حق اس بنا پر ہے کہ وہ انسان کا پیدا کرنے والا اور اس کا روزی رساں ہے، مال و دولت کا آفرنیدہ اور عطا کنندہ ہے، اسی کے حکم سے کائنات کی ہر چیز انسان کی خدمت کر رہی ہے، اس لیے انسان پر اس کا شکر واجب ہے اور اللہ نے خود اس کی یہ شکل مقرر کی ہے کہ اس کا خوشحال بندہ اس کے حاجت مند بندوں کی مدد کرے۔ اور انسان کا حق اس بنا پر ہے کہ امیر اور غریب انسانیت یا عقیدے یا انسانیت اور عقیدے دونوں میں باہم دگر بھائی بھائی ہیں اس لیے غریب اور حاجتمند آدمی کا اپنے خوشحال بھائی کے مال میں لازماً ایک حق ہے جسے اس کو ادا کرنا چاہیے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں کہ دولتمند کے مال کے ساتھ فقیر بے نوا کے حق کا کیا تعلق ہے اور کیوں، جو کچھ فرمایا ہے، بہتر ہوگا اگر اس کا ذکر یہاں کر دیا جائے۔

"پہلی بات یہ ہے کہ کسی انسان کو اگر بقدرِ ضرورت مال مل جائے تو زیادہ حقدار ہے اس بات کا کہ اُسے اپنے قبضے میں رکھے، کیونکہ دوسرے ضرورت مندوں کی طرح اُسے بھی مال کی ضرورت ہے، اور اِس صورت میں صاحبِ مال کا حق دوسروں پر مقدم ہے۔ البتہ جب مال اس کی ضرورت سے زائد ہو اور کوئی دوسرا حاجتمند انسان بھی موجود ہو، تو یہاں دو اسباب ایسے جمع ہو جاتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ جہاں تک مال کے مالک کا تعلق ہے اُس نے حصولِ مال میں چونکہ محنت و کوشش کی ہے اس لیے اس کا اپنے مال کے ساتھ ایک دلی تعلّق ہے۔ اور جہاں تک غریب و محتاج کا تعلق ہے اُسے چونکہ مال کی ضرورت ہے اس لیے وہ بھی مال کے ساتھ ایک قسم کا تعلق رکھتا ہے۔ جب یہ دو متضاد اسباب اکٹھے ہو جائیں تو پھر حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں اسباب میں ہر سبب کا امکان بھر لحاظ رکھا جائے۔ چنانچہ کہا جائے گا کہ مالک کو چونکہ اپنے مال پر حق اکتساب اور دلی تعلق کا حق حاصل ہے اور فقیرِ بے نوا کو صرف حقِ احتیاج، لہٰذا ہم مالک کے حق کو اس حد تک ترجیح دیں گے کہ اُسے مال کے بیشتر حصّے پر قابض رہنے دینگے اور غریب کو اس میں سے ایک حصّہ دلوائیں گے تاکہ دونوں کو تاحدِ امکان مطمئن کیا جا سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی مالدار اپنی اصلی ضروریات سے زاید مال کو روکے رکھے اور مال جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ اُس سے پُورا نہ کیا جائے، تو یہ ایک طرح سے اللہ کی حکمتِ تکوینی کو ظہور پذیر ہونے سے روکنے کی کوشش ہو گی جو بالکل جائز نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مال کا ایک حصّہ غریبوں کی طرف لوٹا دیا جائے تاکہ یہ حکمتِ الٰہی معطّل ہو کر نہ رہ جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ فقراء و مساکین اللہ کا کنبہ ہیں اور اُمراء و اغنیاء اللہ کے خزانچی ہیں، کیونکہ ان کے پاس جو مال ہے وہ سب اللہ کا ہے اور یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ کوئی مالک اپنے خزانچی سے کہے کہ "میرے خزانے میں سے کچھ مال میرے کنبے کے غرباء و مساکین کو دے دے"۔

(باقی)

معیشتِ اسلام ــــ فکر و نظام

جناب عبد المجیب صاحب

(۲)

د،، اسلامی ریاست چونکہ ایک فلاحی مملکت قرار دی گئی ہے اس لیے اس کا معاشی نظام رفاہِ عامہ کے اجتماعی کاموں کے علاوہ لوگوں کی کفالتِ عامہ کا ضامن بھی ہے ۔ کفالت عامہ سے مراد یہ ہے کہ دارالاسلام میں بسنے والے ہر شخص کے لیے بنیادی ضروریاتِ زندگی یعنی غذا، لباس، رہائش، علاج اور تعلیم کا اہتمام کیا جائے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس کا کوئی سرپرست نہ ہو، اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے ۔ (ترمذی، ابواب الفرائض ۔ باب ماجاء فی میراث المال) ۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جس فرد کا مملکت میں کوئی کفیل نہ ہو اس کی کفالت کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے عائد کردہ اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے معرضِ وجود میں آتی ہے ، اور اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم رعایا کی کوئی تفریق نہیں ۔ سماجی تحفظ کے لیے یہ اصولِ کفالتِ عامہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ کسی دوسرے معاشی نظام میں اس کی کوئی نظیر نہ مل سکے گی ۔ جب اور جس وقت بھی کوئی فرد زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم ہوتا ہے حکومت اسے پورا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے ۔ اب اگر اسلام کا معاشی نظام یہ ضمانت دیتا ہے کہ کوئی مزدور یا کسان مفلس ہو یا کوئی عام باشندہ بے روزگار ہو جائے تو اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لیے سرکاری خزانہ حاضر ہوگا تو آخر ایسے معاشرہ میں معاشی خوف و یاس اور کرب و بے چینی کا کہاں گزر ہو سکے گا ۔ ایسے معاشرہ میں تو ہر طرف امن و امان، چین و سکون اور اطمینانِ قلب و ذہن ہی جاری و ساری ہوگا ۔ اِس کفالتِ عامہ کی طرح

رفاہِ عام بھی اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملک کی عام معاشی ترقی، رفاعی امور، ذرائع حمل ونقل، ذرائع آبپاشی، برقی انتظامات، زرعی وصنعتی وسائل اور جان ومال اور انصاف کی نگہداشت حکومت پر عائد کردی گئی ہے۔ یہ ہے وہ فلاحی مملکت کا نقشہ جو اسلام کا معاشی نظام فراہم کرتا ہے اور جو اجتماعی فلاح وبہبود کی ساری کوششوں میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

(۸) مجموعی فلاح وبہبود کی انجام دہی کے لیے اسلامی نظامِ معیشت نظمِ بیت المال قائم کرتا ہے۔ بیت المال کے ذرائع آمدنی حسبِ ذیل ہیں:

زکوٰۃ۔ مسلمانوں کے جمع شدہ سرمایہ، زیورات، اموال تجارت اور مویشیوں وغیرہ پر سالانہ فریضہ۔

جزیہ۔ غیر مسلموں پر سالانہ ٹیکس۔

عُشر۔ مسلمانوں کی زرعی اراضی پر مالگذاری۔

خراج۔ غیر مسلموں کی زرعی اراضی پر مالگذاری۔

وقف۔ مسلمانوں کی وقف کردہ منقولہ وغیر منقولہ جائداد اور اس کی آمدنی

عشور۔ اموالِ تجارت کی درآمد پر محصول۔

کراء الارض۔ سرکاری اراضی کی آمدن۔

خُمس۔ معدنیات، دفینوں اور مالِ غنیمت سے آمدنی۔

فئے۔ جنگی دشمن کا چھوڑا ہوا مال اور زمین۔

اموال فاضلہ۔ متفرق آمدنی مثلاً لاوارث کی دولت وجائداد یا غیر معمولی حالتِ قحط وسیلاب میں دولتمندوں سے حاصل کردہ اموال۔

ضرائب۔ عام ملکی ضروریات کے لیے مختلف محصولات۔

مالی سزائیں۔ مختلف جرائم وبدعنوانیوں کا خمیازہ بشکل جرمانہ اور ضبطیٔ مال وغیرہ۔

سرکاری آمدنی کے لیے بھرپور ذرائع ووسائل کا یہ وہ عظیم الشان نظمِ بیت المال ہے جس کے ذریعہ ملک میں کفالتِ عامہ اور رفاہِ عام کا مکمل بندوبست کر دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ بیت المال کا یہ جامع

انتظامِ ملت میں تقسیمِ دولت کے معاملے میں پائے جانے والے تفاوت کو کم سے کم کرتا ہے سماجی تحفظ و بیمہ کی دنیا میں یہ وہ پہلی اور جامع سکیم ہے جس سے بہتر کوئی اور اسکیم بنانا انسانی دماغ کے بس کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اس عظیم اسکیم کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ معاشرہ میں افراطِ زر کا بھیانک مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

(۹) اسلامی ریاست کے شعبۂ معیشت کا ایک اہم وظیفہ یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے معاشی استحصال کو ختم کر کے معیشت کو عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار کرے۔ اس غرض کے لیے کسان، مزدور، رنجی، تجارتی و صنعتی ملازمین اور دیگر محنت کاروں کے جملہ شرائطِ ملازمت، اوقاتِ کار، طریقِ کار اور معاوضوں کی جانچ پڑتال نہایت ضروری ہے۔ اگر زمیندار اور مالکان کا طرزِ عمل معقول و مناسب معلوم نہ ہو تو حکومت کو ان کے معاملات میں مداخلت کرنے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ جہاں حکومت کا مجموعی نظامِ ترغیب و تلقین مؤثر ثابت نہ ہو سکے وہاں ضابطہ بندی اور قانون سازی سے مظلوموں کی حق رسانی کی جانی چاہیے۔ اور یہی کچھ اسلام کے معاشی نظام کے ضروری وظائف کا ایک نہایت اہم حصہ ہے۔ لہٰذا اسلام معاشی میدان میں بالادستوں سے زیر دستوں کو ان کے منصفانہ حقوق دلوانے کی پوری پوری ضمانت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ غیر معمولی حالات میں اسلامی ریاست مفادِ عامہ کے مدِ نظر اُجرتوں، کرایوں، لگان، قیمتوں اور نفع کی شرحیں بھی مقرر کر سکتی ہے۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو کمزوروں کی معاشی بدحالی اور اقتصادی تنگدستی کو دُور کرنے کے لیے اس قسم کے سارے اقدامات معقول، عادلانہ اور جائز قرار پائیں گے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ اسلامی معاشیات صرف انصاف پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ احسان کا بھی حکم دیتی ہے جو بہت آگے کی منزل ہے۔ ایسی منزل جہاں حقدار کو اس کے حق سے بہت زیادہ ملتا ہے۔

(۱۰) اسلام کے معاشی نظام کے اب تک بیان کردہ رہنما اصولوں سے ایک حقیقت جو قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں بڑی متنوع اور ہمہ گیر ہیں۔ لہٰذا ان وسیع معاشی ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور ملی مفادِ عامہ کے پیشِ نظر غیر معمولی نوعیت کے املاک

اور معاشی ذرائع و وسائل کو مشترکہ قومی تحویل میں لیا جا سکتا ہے۔ حکومت اسلامی پر اجتماعی مصالح کے تحفظ، شر و فساد کے ازالہ اور دفاعی قوت تعمیر کرنے کی جو بنیادی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں ان کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ بعض صنعتوں کو حکومت اپنے ہاتھ میں رکھے مگر اس کا انتظام و انصرام عوام کے با اعتماد نمائندوں کے مشوروں سے کرے۔ دفاعی صنعتوں کے علاوہ بھی ایسی صنعتیں ہوتی ہیں جن کی نجی تنظیم ناممکن ہوتی ہے بعض دوسری صنعتیں ہیں کہ جن کا نجی ہاتھوں میں رہنا بہ حیثیت مجموعی معاشرہ کے لیے نقصان دہ بن جاتا ہے۔ پھر رفاہِ عامہ کی کچھ صنعتیں اور ادارے تو سرے سے نفع آور ہی نہیں ہوتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اسلام کے نظامِ معیشت میں مشترکہ قومی ملکیت کا دائرہ ہمیشہ اور ہر حال میں محدود ہی رہے گا۔ قومی تحویل میں لیے جانے والی تمام ضروری اور کلیدی صنعتوں کا اصل مقصود نفع کمانا نہ ہو گا بلکہ خدمتِ ملت و مفادِ عامہ ہو گا۔ نفع آوری کی حیثیت محض ثانوی ہو گی۔ ان حقائق کی روشنی میں اگر جائزہ لیا جائے تو خالص اجتماعی مفاد کے پیش نظر مندرجہ ذیل املاک اور صنعتوں کو اجتماعی ملکیت میں لیا جا سکتا ہے:۔

(الف) مرکزی بینکنگ

(ب) اسلحہ سازی اور دفاعی ضروریات کی دیگر صنعتیں۔

(ج) ایٹمی توانائی کے استعمال کے ادارے۔

(د) اسٹیل اور بحری و فضائی جہازوں اور ریل گاڑیوں کے کارخانے۔

(ہ) آبی و برقی استعمال کی مختلف صنعتیں۔ مثلاً بند اور بجلی گھر

(و) ڈاک و تار کے محکمے۔

(ز) بری، بحری اور فضائی ذرائع حمل و نقل۔

(ح) سمندر، دریا، چشمے اور جھیلیں۔

(ط) پہاڑ، جنگلات، چراگاہیں اور غیر مملوکہ زمینیں۔

(ی) معدنیاتی کانیں اور قدرتی خزانے مثلاً ہیرے، جواہرات، سونا، چاندی، لوہا، کوئلہ،

پارہ، تانبہ، سیسہ، نمک اور تیل اور گیس کے ذخائر وغیرہ۔

دک، عوام کی رضا کارانہ وقف کردہ جائداد۔

معیشت اسلام میں قومی ملکیت کا تصور اور اس کی نوعیت بالکل منفرد ہے۔ اس میں محدود اجتماعی ملکیت کی تو گنجائش بلا شبہ ہے مگر کلی قومی ملکیت کا کوئی مقام نہیں۔ اسلام کا اقتصادی نظام جس طرح بے لگام انفرادی ملکیت کو گوارا نہیں کرتا اسی طرح وہ بے قید قومی ملکیت کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ علمی دلائل کے علاوہ تجربہ و مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ بے لگام انفرادی ملکیت کا نتیجہ معاشی افراتفری ہوا کرتی ہے اور مکمل قومی ملکیت ایک طاقتور آمریت پر منتج ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے "انفرادیت" اور "اجتماعیت" کے ایک حسین امتزاج سے "جامعیت" کا اصول اپنایا ہے جس کی رو سے افراد اور اجتماع دونوں ہی بیک وقت اپنے اپنے دائروں میں برسر عمل رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتے۔ لہٰذا اس طرح کی معقول و متوازن اور محدود اجتماعی ملکیت سماجی زندگی کے لیے نقصان دہ ہونے کے بجائے ممد و معاون ثابت ہوگی۔ ان تصریحات کی روشنی میں اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے معاشی نظام نے جس قسم کے قومی ملکیت کے اصول کو سامنے رکھا ہے وہ دو وجوہ کی بنا پر قطعی ضرر رساں نہ ہو سکے گا۔

اولاً یہ کہ ملک کی ساری قومی دولت حکومت کے تصرف میں نہیں آئے گی لہٰذا سرکاری ارتکاز دولت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اس طرح کلیت پسند اقتدار کا قیام ممکن نہ ہوگا۔

ثانیاً یہ کہ اسلامی ریاست کا نظام حکومت شورائی اور جمہوری ہونے کی وجہ سے اس کے معاشی حلقہ میں آمریت یا نوکر شاہی جنم نہ لے سکے گی اور عوام میں بے بسی و بے چارگی راہ نہ پا سکے گی۔

اِس طرح اسلام کے نظام معیشت میں محدود قومی ملکیت کا اصول تمام معاشی برائیوں سے پاک اور بھلائیوں سے لبریز ہے۔

(۱۱) اسلام کے معاشی نظام کا گیارھواں رہنما اصول یہ ہے کہ ملک میں ہر انفرادی اور اجتماعی معاشی جد و جہد اخلاقی اقدار و ضوابط کی تابع رکھی جائے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اخلاقی نشو و نما

کے بغیر ملت کی معاشی و مادی ترقی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ زیادہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اخلاق اور سیرت و کردار کی تعمیر کے بغیر مادی و معاشی فلاح و بہبود کا حصول ناممکن ہے۔ معاشرہ میں ایسی اخلاقی و روحانی فضا پیدا کرنا لازمی ہے جس کی مدد سے فلاحِ ملت کے اغراض و مقاصد رضا کارانہ عمل ہی سے حاصل ہو جائیں۔ اسلامی نظام قانون و قوت کا سہارا لینے سے پہلے لوگوں کے لیے تعلیم و تربیت، ترغیب و تلقین، ہدایت و رہنمائی اور اخلاقی دباؤ کا انتظام کرتا ہے تاکہ عوام ملکی فلاح و بہبود کی خاطر از خود غلط کاموں سے اجتناب کریں۔ اس طریقِ کار کی خوبی یہ ہے کہ اس سے ایک طرف تو افراد کے اخلاقی و روحانی ارتقاء میں مدد ملتی ہے اور دوسری طرف لوگوں کی انفرادی آزادیاں بھی مجروح نہیں ہونے پاتیں۔ خوشدلی سے کیے جانے والے کاموں میں جو لطف اور حسن ہے وہ جبر کے استعمال میں ہرگز نہیں ہے۔ لہٰذا قانون و قوت کا استعمال بدرجۂ آخر ہونا عین قرینِ مصلحت ہے۔ مختصراً یہ کہ اسلامی نظام میں مادی و معاشی ترقی اور اخلاقی و روحانی نشو و نما کا ہر وقت اور ہر مرحلہ پر چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اور اسی انضمام کی بدولت یہ نظام فلاحِ ملت کی بہترین صورت گری کرتا ہے۔ مثال کے طور پر تجارتی لین دین میں دیانت، ناپ تول میں انصاف، قول و فعل میں مطابقت اور کاروباری عہد و پیمان کی پابندی اسلام کے بیک وقت اخلاقی اصول بھی ہیں اور معاشی قوانین بھی۔

(۱۲) اسلام کے معاشی نظام کا بارھواں اور آخری رہنما اصول اس کے نظام احتساب و محاسبہ سے متعلق ہے۔ اگر اوپر بیان کردہ معاشی اصولوں کا منطقی تسلسل نگاہ میں رہے تو اسلام کے نظامِ احتساب و محاسبہ کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے گا۔ کوئی نظام خواہ کتنے ہی خوبصورت اور قابلِ عمل اصولوں پر مبنی ہو، اگر اس میں تعمیری تنقید اور اصلاحی گرفت کے ہمہ وقتی انتظام کا خیال نہ رکھا جائے تو اس کی عالیشان عمارت کسی لمحہ بھی مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت میں دوسرے نظاموں کے برعکس ایسا کوئی جھول نہیں ملتا۔ اسلام نے عوام اور حکومت کو ایک دوسرے کی معاشی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں پر نگران و محافظ مقرر کیا ہے۔ عوام اور حکومت کو ایک دوسرے کی تمام معاشی کارروائیوں پر احتساب کرنے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے تاکہ انفرادی و اجتماعی

معاملات و اعمال کو شریعت کی مقرر کردہ حدود کا پابند رکھا جائے ۔ غلطی کرنا انسانی فطرت ہے مگر غلطیوں کی اصلاح نہ کرنا قومی خودکشی کے مترادف ہے ۔ سماجی اصلاح کے لیے احتساب و محاسبہ کا پیہم عمل ہی وہ مؤثر طریقہ ہے جس کے ذریعہ عوامی فلاح و بہبود اور معاشی ترقی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے ۔ حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو یہ بات بآسانی واضح ہو سکتی ہے کہ اسلام کا احتسابی پروگرام نہایت موزوں اور متوازن ہے جس کی نظیر بھی کوئی دوسرا معاشی نظام پیش کرنے سے عاجز ہے ۔ اسلام کے نظام احتساب و محاسبہ کو حرکت دینے اور زندہ رکھنے میں عوام کی معتمد مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کا کردار سب سے زیادہ مؤثر اور سب سے زیادہ اہم ہوگا ۔ اسلامی نظامِ معیشت کا یہ احتسابی اصول وہ آخری ستون ہے کہ جس کی مدد سے ملک کی پوری معاشی عمارت پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے اور اس کے بعد پھر کسی شگاف کا خطرہ باقی نہیں رہتا ۔ اس مضبوط و مستحکم عمارت کے مکینوں میں نہ حکومتی ادارہ آمرِ مطلق بننے کا رجحان رکھتا ہے اور نہ عوام میں سے کوئی اپنی من مانی حرکت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے ۔ وہ سب کے سب صلح پسند مکین کی حیثیت سے محبت و اخوت کے ساتھ امن و آشتی کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔

یہ ہے اسلام کے انقلابی معاشی نظام کا وہ نقشہ جس پر نہ صرف یہ کہ تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہے بلکہ جو ایک معیاری نظامِ معیشت کی کسوٹی پر بھی پرکھنے کے بعد پورا اترتا ہے ۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے اسلامی نظامِ معیشت کا مجموعی مزاج اور اس کا ایک ایک قاعدہ اپنی جگہ بالکل منفرد و ممتاز ہے ۔ اس میں فرد کی معاشی آزادی بھی ہے اور اس پر ضروری پابندی بھی، معقول انفرادیت بھی ہے اور مناسب اجتماعیت بھی ۔ اخلاقی تربیت بھی ہے اور مادی خوشحالی بھی، سیرت و کردار بھی ہے اور اقتصادی ترقی بھی ۔ اس لاجواب میانہ روی کے باعث اسلام کا معاشی نظام نہ تو سرمایہ داری سے کوئی مشابہت و مماثلت رکھتا ہے اور نہ سوشلزم سے کوئی مناسبت و مطابقت ۔ اسلام نے تو اشتراکیت اور سرمایہ داری کے دونوں ٹیڑھے راستوں سے ہٹ کر ایک بالکل اچھوتا، جداگانہ اور افراط و تفریط سے پاک تیسرا راستہ تجویز کیا ہے جو ہر علمی و عملی حیثیت سے صراطِ مستقیم ہی ثابت ہوتا ہے ۔ لہٰذا یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ انسانی معاشرہ کے لیے اس سے بہتر معاشی نظام بنا

مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

چونکہ اسلام کے مثالی نظامِ معیشت میں انسان کی ہر معاشی ضرورت کے پورا ہونے کا اہتمام درمعاشرے کے ہر معاشی مسئلہ کا تسلی بخش حل موجود ہے اس لیے اس نظام کے مجموعی مزاج اور اس کے رہنما اصولوں کی روشنی میں تمام وقتی و جزوی مسائلِ معیشت کی ہر گتھی سلجھائی جاسکتی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس کام کے لیے مرعوب و مغلوب دماغوں کے بجائے اسلامی و اجتہادی فکر رکھنے والے اہلِ علم درکار ہوں گے۔ ایسے سہل انگار حضرات اس کام کو انجام نہیں دے سکتے جو اسلام کے معاشی نظام کا مطالعہ کیے بغیر اور اسے سمجھے بغیر بیرونی افکار و نظریات کو درآمد کرکے ان کو مشرف بہ اسلام کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تو ان کے ذہن و فکر کی مفلسی مرضِ تقلید و نقالی میں مبتلا کردیتی ہے اور یہ بالآخر طرح طرح کی شعبدہ بازیوں پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک شعبدے اور شوشے کا نام "اسلامی سوشلزم" ہے۔ اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ "اسلامی کیپٹل ازم" کی اصطلاح جتنی بے معنی اور احمقانہ ہوسکتی ہے اتنی ہی لغو و مہمل ترکیب اسلامی سوشلزم کی ہے۔ اسلام تو خود اپنی جگہ ایک الگ ضابطۂ معیشت تشکیل دیتا ہے، بھلا اس میں پیوندکاری یا اس کی پیوندکاری، کیسے اور کیونکر کی جاسکتی ہے؟ عقل و منطق کی رو سے تو یہ ممکن نہیں ہے، پھر اسلام کا جوڑ کیپٹل ازم یا سوشلزم کے ساتھ چہ معنی دارد؟ ایسے لوگ اگر ذہنی غلامی کے خول سے نکل کر اسلام کے جامع و متوازن نظامِ معیشت کا بے لاگ مطالعہ کریں تو وہ خود اپنی طفلانہ حرکات پر شرمسار ہوں گے اور آئندہ کبھی اسلامی کیپٹل ازم یا اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند نہ کریں گے۔

اسلام کا معاشی نظام ایک اور نقطۂ نظر سے بھی دوسرے نظاموں سے مختلف و منفرد ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ نظام اپنی مکمل ترین شکل میں روئے زمین پر ایک عرصہ تک نافذ رہ چکا ہے۔ نہ صرف کامیابی کے ساتھ قائم ہوا تھا بلکہ اس نے دنیا میں زبردست انقلاب برپا کردیا تھا۔ ایسا اصلاحی انقلاب جو نہ اس سے پہلے کبھی وجود میں آیا تھا اور نہ اس کے بعد آج تک دنیا نے دیکھا۔ دورِ نبویؐ، خلافتِ راشدہ اور خلافتِ عمر بن عبدالعزیز اس انقلابی نظام کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ تاریخ کے اس کامیاب ترین فلاحی دور

کا اعتراف تو غیر مسلم محققین بھی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب اسلام کے اصولوں پر معاشی نظام تعمیر کیا گیا تو وہ سب سے زیادہ خوشحالی، سب سے زیادہ متوازن اور سب سے زیادہ فلاح و خیر کا موجب ثابت ہوا۔ وہ ماحول ایسا تھا کہ آسمان اپنی رحمتیں نازل کرتا تھا اور زمین اپنی برکتیں اگلتی تھی۔ اس نظام نے انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کیا، نسل، قوم اور طبقات کے تمام جھوٹے بتوں کو توڑ ڈالا، افلاس و غربت کو نیست و نابود کر دیا اور معاشی ظلم و ستم کو صفحہ ہستی سے مٹا کر ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیا جس میں باہمی تعاون اور اخوت و محبت کے دلآویز اجالے پھیلے ہوئے تھے۔ نیکی کی تمام قوتیں فضا میں پھیلنے اور پھولنے لگیں اور سماجی برائیاں ہوا میں تحلیل ہوگئیں، یہاں تک کہ اس نظام نے خوشحالی کو اتنا عام کر دیا کہ زکوٰۃ و صدقات دینے والے تو بہت تھے لیکن لینے والا تلاش کے باوجود نہ ملتا تھا۔

انسان و انسانیت کی طویل تاریخ میں صرف اسلام کا دور ہی وہ دور ہے جس میں عدل، انصاف اور فلاح و کامرانی کی جگمگاہٹ نظر آتی ہے۔ یہ نظام آج بھی اسی طرح اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ایک بار پھر نافذ ہو سکتا ہے۔ ضرورت اصل میں صرف اُن اہلِ ایمان کی ہے جن کی خودی کو غلامی کے بوجھ نے کچل نہ ڈالا ہو اور جن کے ذہن اندھی تقلید و مرعوبیت کے مرض میں گرفتار نہ ہوں۔ جن کے دل اسلام کی حقانیت سے معمور ہوں اور جن کے سینوں میں یہ ولولہ بھی موجود ہو کہ وہ دنیا کے چھائے ہوئے باطل نظاموں سے مصالحت کرنے کے بجائے، ان کے خلاف سینہ سپر ہو کر بغاوت کریں اور برسرِحق نظام اسلامی کو روئے زمین پر نافذ و غالب کر دکھائیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ نیک تمناؤں اور پُرخلوص عزائم کے ساتھ ساتھ یہ سمجھنا بھی بے حد ضروری ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت کے مقرر کردہ حدود دائرہ میں رہتے ہوئے معاشرہ کی تشکیل جدید کس ترتیب سے کی جائے؟ اس کے لیے بہترین عملی اقدام و مراحل کیا ہونے چاہئیں؟ اپنے موجودہ حالات، مسائل اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی اقتصادیات کے رہنما اصولوں کے تحت عصرِ حاضر میں نظامِ معیشت کی عملی صورت گری کی شکل کیا ہو؟ اصولوں کے انطباق کا یہ مسئلہ

چینی سوشلزم

(از جناب ریاض الحسن صاحب)

جو جماعتیں یہ یقین رکھتی ہیں کہ اللہ کا دین مکمل ہو چکا، اور ہمیں خالص اسلامی نظام کے سوا کسی کافرانہ نظام کے نظریات اپنانے کی ضرورت نہیں، ان پر اکثر یہ الزام تھوپ دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ چونکہ سوشلزم کی مخالفت کرتے ہیں اس لیے در اصل یہ چین کے دشمن ہیں اور چین کی پاکستان سے دوستی کو پسند نہیں کرتے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ آج جو لوگ اپنے کو چین کی دوستی کا علمبردار کہہ رہے ہیں، ان کی اکثریت اب تک امریکہ نواز رہی ہے، بلکہ امریکی اور انگریزی تہذیب کو تو یہ اس وقت بھی اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ابن الوقت ہیں، جس بات میں فائدہ دیکھتے ہیں اور جہاں سے حصولِ دنیا کی اُمید بندھتی ہے اسی طرف ہو لیتے ہیں۔ نہ ان کا کوئی دین ہے نہ ضمیر۔

ایک زمانہ تھا کہ ترکوں نے جرمنی سے دوستی کی تھی اور ان سے مل کر جنگ عظیم اوّل میں حصہ بھی لیا تھا۔ مگر اس دوستی کی بنا پر انہوں نے عیسائیت کو نہیں اپنایا نہ "اسلامی عیسائیت" قسم کی کوئی اصطلاح

(بقیہ معیشتِ اسلام)

اس لیے غور و فکر کا متقاضی ہے کہ اسلامی تاریخ میں عملی تفصیلات و جزئیات کے طے کرنے کا کام ہر دور کے لحاظ سے ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا یہ نازک اور محنت طلب کام وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں مناسب یہ ہے کہ اُن تدابیر کا جائزہ لے کر احاطہ کر لیا جائے جو آج اسلامی نظام معیشت کے عملی نفاذ اور تشکیلِ جدید کی ابتدا کے لیے ضروری بھی ہوں اور جائز و مباح بھی۔

(باقی)

ایجاد کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کے بہت سے اکابر نے انگریزوں سے تعاون کیا لیکن ایک مغلوب و مفتوح قوم کی حیثیت سے غالب و فاتح قوم کے ساتھ تعاون کرنے کے باوجود نہ انہوں نے انگریزوں کے مذہب کو قبول کیا نہ اسلام کے ساتھ اس کی پیوندکاری کا تصور تک کبھی ان کے دماغ میں آیا۔ بلکہ ان میں سے اکثر نے علانیہ عیسائیت کی مخالفت کی، مغربی تہذیب پر تنقیدیں کیں اور اسلام پر عیسائی پادریوں اور مغربی مصنفین کے حملوں کا جواب دیا۔

آج جبکہ پاکستان ایک آزاد ملک ہے، کسی مغربی یا مشرقی قوم کا محکوم نہیں ہے۔ اور کسی قوم کی دوستی کا فائدہ اگر پاکستان کو پہنچ رہا ہے تو پاکستان کی دوستی کا فائدہ اس قوم کو بھی پہنچ رہا ہے۔ ہمارے ہاں یہ عجیب و غریب قسم کے ذہنی غلام پیدا ہو رہے ہیں جو کہتے ہیں کہ چین کی دوستی کی خاطر، یا اس کی امداد کے شکریے میں چینی نظام کو بھی اپنا لو، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ سوشلزم کی مخالفت چین کی دشمنی کی ہم معنی ہے۔ ایسے غلام ہماری تاریخ میں کبھی پیدا نہ ہوئے تھے۔

ہم کہتے ہیں کہ چین اور پاکستان میں اگر کوئی اختلاف پیدا ہو سکتا ہے تو اس کے اصل موجب وہ لوگ ہوں گے جو یہ کہتے ہیں کہ چینیوں کی دوستی کے ساتھ ساتھ ان کے نظام کو بھی اپنا لو۔ جب یہ لوگ اسلام کے اقتصادی نظام کے بجائے سوشلزم کے اقتصادی نظام کے نفاذ کے لیے آواز اٹھاتے ہیں اور اس کی تبلیغ کرتے ہیں تو اسلامی نظام کے حامی بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ اصل حقیقت کو واضح کریں۔ اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چین یا پاکستان کی دوستی میں رخنہ پڑے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آ کر یہودیوں سے معاہدہ کیا اور تعلقات استوار کیے تو ان تعلقات کے باوجود اسلام کی تبلیغ بھی جاری رکھی اور قرآن مجید میں یہودیوں کی غلطیوں کی وضاحت بھی کی جاتی رہی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دین نصیحت ہے۔

مسلمان تو اپنے سگے بھائی کو بھی راہِ حق کی تلقین کرتا ہے۔ پھر بھلا اگر وہ دوست کو سیدھی راہ نہ دکھائے اور اس کے عیوب اس پر واضح نہ کرے گا تو کیا دشمن کو نصیحت کرنے جائے گا؟ مسلمان تو پیدا ہی تبلیغ کے لیے ہوتا ہے۔ سچا مسلمان یہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ کسی کی دوستی کا دم بھی بھرے لیکن اس کی آستین میں جو سانپ گھسا ہوا ہو اس کی طرف اشارہ نہ کرے۔ سچے دوست کا فرض یہی ہے کہ وہ

اپنے دوست کو خطرہ سے آگاہ کر دے چاہے یہ بات دوست کو کڑوی ہی کیوں نہ معلوم ہو۔

اسی نصیحت، ہمدردی اور انسان دوستی کے جذبے کے تحت ہم چینی سوشلزم کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں تاکہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے اور ممکن ہے کہ بات ان کی سمجھ میں آجائے ہمیں پوری امید ہے کہ تعصب سے بالاتر ہو کر جو شخص بھی ان واقعات کو دیکھے گا وہ حق کو پالے گا۔ اس کے لیے ہم خود سوشلسٹ مصنفین اور چین کے دوستوں کے مضامین پیش کرتے ہیں۔

چین میں طالب علموں کی حالت | طارق علی پاکستانی جو بائیں بازو کے سوشلسٹ لیڈر ہیں ان کی مرتب کردہ کتاب NEW REVOLUTIONARIES یعنی "نئے انقلابی" ہم کو چین کے طالب علموں کی حالت یوں سناتی ہے:۔

"۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء کے دوران چینی طالب علموں کی خاص طور پر حالت بہت ہی ناگفتہ بہ تھی۔ خوراک کی بے حد قلت تھی۔ شنگھائی کی ایک طالبہ نے مجھے بتایا کہ ۱۹۶۰ء کے پورے سال کے دوران مجھے صرف ایک مرتبہ گوشت کھانا نصیب ہوا ہے[1]۔ سرکاری حکم نامہ میں جسمانی محنت کرنے والوں اور دوسروں کی خوراک کی مقدار کیلوریوں میں مقرر ہو گئی۔ بعض یونیورسٹیوں میں پڑھائی بالکل ختم ہو گئی اور ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت بستروں پر گزاریں تاکہ ان کی طاقت خرچ نہ ہو۔ دوسری یونیورسٹیاں بالکل بند کر دی گئیں اور طالب علموں کو کمیونیوں میں مزدوری کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔" (صفحہ ۱۱۹)

چینی سوشلزم اور عوام کی درگت | مذکورہ بالا مصنف مزید لکھتا ہے:

"۱۹۶۶ء کے دور میں پارٹی اور نوجوان کمیونسٹ لیگ ایک ایسی بند دکان ہو کر رہ گئی جو صرف ان کے لیے تو کھلی ہوئی تھی جن کے والدین پارٹی کے ممبر تھے لیکن اس کے دروازے دیہاتی کاشتکاروں کے لیے اکثر بند رہتے تھے۔"

---

[1] یاد رہے کہ چین میں چھپکلی، مینڈک، چوہے، سوئر، سانپ وغیرہ بھی مرغوب غذا کے طور پر کھائے جاتے ہیں۔ تو گویا کیڑوں مکوڑوں اور مینڈکوں کا گوشت بھی سال میں بمشکل ایک مرتبہ نصیب ہو سکا۔

"... جون ۱۹۶۶ء میں جو ثقافتی انقلاب کا اولین دور تھا پیکنگ کے لڑکیوں کے ماڈل سکول کی طالبات نے یہ سب شکایات سنٹرل کمیٹی اور چیئرمین ماؤ کو لکھ کر بھیج دیں۔ اس خط میں شکایت کی گئی تھی کہ اعلیٰ تعلیم کا تمام داخلہ رجعت پسندوں کے کنٹرول میں ہے اور حکومت کو مشورہ دیا کہ ماڈل اسکول کی تعلیم کے بعد سب طالب علموں کو اپنے اوقات کا خاص حصہ فوجیوں اور کاشت کاروں کے ساتھ کام کرتے ہوئے گزارنا چاہیے... مزید یہ کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ کاشت کاروں اور فوجیوں کی سفارشات پر ملنا چاہیے۔ ماؤ وغیرہ نے یہ سمجھا کہ یہ خط طالبات نے خود نہیں لکھا بلکہ لکھوایا گیا ہے۔ ایک ہفتہ میں اعلان ہو گیا کہ ۶ ماہ تک کسی طالب علم کو داخل نہیں کیا جائے گا۔ جن لوگوں کو یونیورسٹی یا کالجوں میں داخلہ ملنا تھا ان کو فیکٹریوں یا کمیونوں میں کام کرنے کی ہدایات بھیج دی گئیں۔ سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کی وجہ سے نچلے درجے کے طالب علموں کو پرانے بدلے نکالنے کا موقع مل گیا۔"

پروفیسروں اور استادوں کی درگت "اب طالب علموں کو موقع مل گیا ہے کہ وہ استادوں سے پرانے انتقام لیں اور مالی خورد برد، زنا کاری، غیر پرولتاری پیانو بجانے اور بیویوں کے لیے مغربی عطر خریدنے اور اسی طرح کے قسم قسم کے جرائم کا الزام پروفیسروں اور پرنسپلوں پر لگائیں۔ اب بہترین اتھارٹی یعنی خود ماؤ صاحب کی اتھارٹی پر بھی یہ الزامات لگائے جاتے تھے۔ کبھی یہ الزام ٹھیک بھی ہوتے اور کبھی غلط۔ ریڈ گارڈز کو ہمت دلائی جاتی کہ وہ بورژوا (درمیانہ طبقہ کے) استادوں کو سولہ اصولوں کے مطابق تعلیم دیں لیکن انقلاب کے عروج کے زمانے میں یعنی ۱۹۶۶ء کے موسم خزاں میں ان اصولوں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ بہت ہی قابلِ گرفت ظلم و ستم ہوئے۔ لیکن اس وقت حکومت حتیٰ کہ ماؤ صاحب خود بھی کچھ نہ کر سکتے تھے۔ بہت سے انقلابیوں نے غلط طریقے استعمال کیے اور غلط لوگوں پر حملہ کیا۔ تشدد کے عروج کے زمانے میں لن پیاؤ نے اعلان کیا کہ کسی کو

مار اپٹیانہ جائے۔ حالانکہ مارپیٹ تو جاری ہو چکی تھی۔ اب جبکہ سہ رکنی اتحاد قائم ہو گیا تھا تو چین کے قیمتی اور اعلیٰ درجہ کے استاد بیت الخلا صاف کرنے اور کوئلہ اٹھانے کے کاموں پر سے واپس بلائے جا رہے تھے[1] اور ان کو لیکچر دینے کے کام پر دوبارہ فائز کیا جا رہا تھا۔

"... جب تعلیمی نظام اس تعطل کے بعد پھر دوبارہ قائم ہو گا تو استاد اور شاگرد میں زیادہ برابری قائم ہو جائے گی۔ اور نظریہ اور عملی تعلیم میں توازن قائم ہو جائے گا یعنی کہ آدھا دن اسکول میں گزارا جائے گا اور آدھا دن فیکٹری یا کمیون کے کھیت میں۔ مزید ماؤ کی سیاست اسباق اور کورسوں میں زیادہ داخل ہو جائے گی[2]۔"

" ماؤ صاحب کیوں طالب علموں کی طاقت کی امداد لینے پر مجبور ہو گئے اور طالب علموں کو اپنی سیاست کے لیے کیوں گھسیٹا گیا؟ اس کو جاننے کے لیے پچھلے واقعات دیکھنے پڑیں گے۔ ... سنہ ۱۹۶۲ء میں ماؤ کو کہا گیا کہ اب وہ ریٹائر ہو جائیں اور سیاسی طور پر ان کی کرسی خطرہ میں پڑ گئی[3]۔ ہم صرف اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کہ سنہ ۱۹۶۲ء اور سنہ ۱۹۶۶ء کے درمیانی عرصہ میں کیا ہوا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اس دوران میں ماؤ کی مخالف طاقتیں مضبوط ہوتی گئیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۹۶۶ء میں ماؤ کو کرسی سے اتارنے کی کوشش کی گئی اور اس کی جگہ لیو شاؤچی یا پنگ چن کو لانے کی کوشش کی گئی یا مشترک حکومت قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ بہرحال کچھ بھی ہوا ہو، ماؤ نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس کو قدم اٹھانا چاہیے۔ لیو یا تنگ کی تائید کے بغیر ہی آمرانہ طور سے، پیکنگ کمیونسٹ پارٹی کی صفائی کر دی گئی[4]۔ پنگ چن اور اس کے ساتھیوں کو نکال باہر کیا گیا۔ اس طرح کے اقدامات

---

[1] کاش پاکستان کے پرنسپل پرنسپل اور استاد سوشلزم میں اپنی درگت دیکھ کر کچھ سبق سیکھیں۔

[2] اب ناظرین خود اندازہ لگا لیں کہ کرسی کی حفاظت کے لیے بچوں اور طالب علموں سے کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

[3] لیکن باوجود بوڑھے ہونے کے روس کے مشہور خوفناک زار ایفان (IVAN THE TERRIBLE) کی طرح ماؤ نے کرسی چھوڑنا پسند نہ کیا۔ [4] یعنی ماؤ صاحب نے جب کرسی خطرہ میں دیکھی تو چینی کمیونسٹ پارٹی کو ختم کرنے کی چال چلی۔

کو نہ تو پارٹی کے ممبروں نے تسلیم کیا اور نہ پیکنگ کے مزدوروں نے پسند کیا۔ بعض مزدوروں میں تنگ بہت ہر دلعزیز تھا۔ تنگ اور لیو نے دیکھا کہ وہ ان سب باتوں کی تائید نہیں کرسکتے جو ثقافتی انقلاب کے ذریعہ کی جارہی ہیں۔ ایسی صورت میں ماؤ صاحب کس کو کہہ سکتے تھے کہ میرے ہاتھ مضبوط کرو۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ صوبوں کے پارٹی لیڈر ان کو پیکنگ میں دھمکیاں بھی دے چکے ہیں۔ اب ماؤ صاحب کو اپنی پشت پناہی کے لیے ایک اور نئی طاقت چاہیے تھی۔ یہ طاقت ان کو نزدیک ترین PLA (پیپلز لبریشن آرمی یعنی عوامی آزادی کی فوج) میں مل گئی۔ اس طرح سے لن پیاؤ جو سیاست سے مدتوں بیماری کے نام پر غیر حاضر رہا تھا اس کو دوبارہ سیاست میں آنے کا موقعہ فراہم کردیا گیا۔ یہ نیا ادارہ ریڈ گارڈ تحریک تھا ۔ ۔ ۔ (ایک استاد کا بیان ہے کہ جس اسکول میں میں پڑھایا کرتا تھا وہاں شرارت کرنے والے بچوں کو کہا جایا کرتا تھا کہ اگر تم شرارت کروگے تو تم کو ینگ پائنیر میں ممبرشپ نہیں ملیگی۔ یہ ایسی ہی چیز تھی جیسے کہ انگلینڈ میں سکاؤٹ کے بیج ہوتے ہیں۔ یہ لیگ خاص کر ان لوگوں کے لیے ہر وقت کھلی رہتی تھی جو ماؤ کے انقلابی نعرے لگاتے ہوں چین میں مارکسزم کا علم بہت قلیل تھا اور اب بھی بہت کم ہے۔ یقینی طور پر کسی بھی ممبر کو کسی قسم کی ٹریننگ دے کر پختہ نہ کیا گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ماؤ اور اس کی مددگار کمیٹی میں چن لوٹا اور لن پیاؤ تھے اور بعد میں قدرے بدطینت مسز ماؤ بھی شامل ہوگئی۔"

"۔ ۔ ۔ ۔ یہ لیگ اور یہ ثقافتی انقلاب کے کارکن سوشلسٹ انصاف کے نام سے جو مقدمے بھی قائم کرتے ان میں انصاف کا نام و نشان تک نہ ہوتا تھا۔ ماؤ کے دیرینہ وفادار ساتھیوں کے متعلق غلط نظریے قائم کرکے ان کو ختم کردیا گیا۔ تنگ ہشیو پنگ نے خودکشی کی کوشش کی۔ پنگ چن اب غالباً مرچکا ہے۔ صرف لیو شاؤ چی کو اس طرح ختم نہ کیا جاسکا، کیونکہ وہ صوباتی پارٹیوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ لیو کا نام بھی نہ لیا جاتا، بلکہ یہ کہا جاتا کہ بہت مشہور شخص جو سرمایہ داری کی راہ پر چل پڑا ہے۔"

"بعض نوجوان ایسے بھی تھے جو مفت پاسوں پر سفر کرنے کے بجائے اپنی اپنی جگہ پر رہ کر

اپنے اداروں کو درست کرنا چاہتے تھے"۔[۱]

"۔۔۔۔ سنگ کیانگ (مسلمانوں کا علاقہ) میں وانگ این ماؤ کے اپنے ریڈ گارڈ تھے۔ جب پیکنگ سے نوجوانوں کے جتھے پہنچے تو ماؤ کے ان ساتھیوں کو وہاں شہر میں گھسنے نہ دیا گیا اور ان کو پہلی ٹرین سے واپس پیکنگ لوٹنا پڑا۔ پیکنگ میں بھی بہت جگہ مزدوروں نے ان کی مخالفت کی اور پوسٹر لگاتے جن پر لکھا تھا "یہ طالب علم ڈاکو ہیں ان کو فیکٹری میں داخل ہونے مت دو، ان کو جان سے مار دو"۔ اسی وجہ سے کئی جگہ فسادات بھی ہوئے"۔

"ستمبر میں بظاہر ریڈ گارڈز کو تشدد پر اکسانے کے لیے ماؤ نے کہا کہ تم لوگ نوجوانوں کی مسلح انجمن ہو۔ کانٹن کے قریب کاشت کاروں نے درانتیوں سے مسلح ہو کر ان لاٹھی بردار ریڈ گارڈز کو اپنے کھیتوں سے مار بھگایا۔ ریلوے کے مزدوروں نے ریڈ گارڈز کی غنڈہ گردی کے خلاف ہڑتال کر دی ۔۔۔۔ آخر کار جنوری ۱۹۶۷ء میں یہ ریڈ گارڈز کمیونسٹ پارٹی کی شمال مغربی سنٹرل کمیٹی کو الٹنے میں کامیاب ہو گئے ۔۔۔۔ مشکل جب پڑتی تھی جبکہ ہر گروہ لڑکوں کے ریڈ گارڈ کاسٹنگ سسٹم پر قبضہ کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کسی کا قبضہ ہوتا تو کبھی کسی کا ۔۔۔۔ اس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ آپس کی دشمنی بڑھ گئی"۔

جب ماؤ کا مقصد حل ہو گیا اور پرانے کمیونسٹوں کی طاقت اور تعداد کو تشدد سے ختم کر کے رکھ دیا گیا تو طالب علموں کو واپسی کا حکم ملا۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے:

"آخر کار طالب علموں کو کہا گیا کہ وہ صنعتی پیداوار میں مداخلت نہ کریں اور دیہات میں جا کر خزاں کی کٹائی میں کاشت کاروں کی مدد کریں۔ بعض نے ماؤ اور لن کی ہدایات پر عمل کیا۔"

---

[۱] اس سے معلوم ہوتا کہ ماؤ صاحب نے نوجوانوں کو مفت پاس بھی جاری کر دیئے تھے تاکہ وہ ہر جگہ پہنچ کر ماؤ صاحب کا پروپیگنڈہ کریں اور جو ان سے اختلاف رائے رکھتے ہوں ان کی بے عزتی کریں ان کو ماریں پیٹیں اور گالیاں دیں۔ اندازہ کیجیے کہ اگر حکومتِ پاکستان تمام کالج اسکول بند کر کے طالب علموں کو ریلوے اور بسوں کے مفت پاس جاری کر دے اور ان کو من مانی کرنے کی اجازت دے دے تو کیا ہوگا۔

لیکن دوسرے لوگوں نے اپنے دیوانہ پن کو جاری رکھا۔ ۱۹۶۷ء میں یونیورسٹیوں اور اسکولوں کو کھولنے کا ارادہ کیا گیا لیکن بہت سی جگہوں پر ایسا کرنا ناممکن ہو گیا۔ طالب علم سفر کر کے دُور دراز کے علاقوں میں پہنچ چکے تھے، اور استاد اپنی نوکریوں پر واپس آنے سے خوفزدہ تھے۔ بہت سے اسکول اسی گڑبڑ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ استادوں کی بہت بھاری تعداد کو فرار ہونا پڑا تھا۔"

تعلیمی انحطاط ۱۹۶۷ء کے درمیانی زمانہ میں طالب علموں اور اسکول کے بچوں کی تعداد میں سرکاری طور پر کمی کر دی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ اب نئی سرکاری سکیم جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ سب سے اوّل مقام فوج کو حاصل تھا۔ دوسرے نمبر پہ ریڈ گارڈز کا درجہ تھا۔ اور پارٹی جس کو اب زیادہ برا نہیں کہا جاتا تھا اس کو تیسرے درجہ پر رکھا گیا ۔ ۔ ۔ بہت سے پارٹی ممبر جن کو ریڈ گارڈز نے نکال باہر کر دیا تھا ان کو دوبارہ داخل کر لیا گیا۔ چواین لائی نے نوجوانوں کو بتایا کہ چن ژی (وزیر خارجہ) قسم کے لوگ اچھے تھے اور اب ان کو زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہیے۔"

" ۔ ۔ ۔ ۔ اِس مضمون کے لکھنے کے وقت یہ صحیح معلوم نہیں کہ ثقافتی انقلاب میں کون جیت رہا ہے۔ ثقافتی انقلاب میں ۔ ۔ ۔ ۔ نوجوانوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا گیا۔ مخالف پارٹی جو کہ طاقتور تھی اس کو اپنی بات کہنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا تھا، ریڈ گارڈز کو اپنے اخبارات کے چھاپنے کی اجازت تھی لیکن مخالفین کو کوئی اخبار چھاپنے کی اجازت نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عوام ماؤ کے حق میں ہوتے تو کلچرل انقلاب اور ریڈ گارڈز کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔"[1]

تشدد کا دَور دورہ اور معاشی بدحالی تعجب تو اس بات کا ہے کہ ہمارا دوست ملک یعنی چین سٹالن کے زمانہ تک روس کا دوست رہا اور بعد میں اس کا مخالف ہو گیا۔ اب تک وہ سٹالن کی تعریف میں

[1] NEW REVOLUTIONARI'S EDITED BY TARIQ ALI PP 119-29

رطب اللسان ہے اور اس کی پالیسیوں کو سراہ رہا ہے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود چین کے عوام آج کل کس دور سے گزر رہے ہیں۔ شاید موجودہ لیڈروں کے بعد کسی وقت اصل حالات نئے لیڈروں کے ذریعہ منکشف ہوں جس طرح سٹالن کے بعد ہوتے۔

حال ہی میں روس سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے DEVELOPMENTS IN CHINA۔ یہ کتاب پروگریس پبلشرز ماسکو نے چھاپی ہے۔ اس کتاب کا مصنف PROF. M SLDKOVSKY لکھتا ہے کہ "جنوری ۱۹۶۷ء میں بہانہ بنا کر ملک پر فوج کا قبضہ کرا دیا گیا، یعنی مارشل لاء لگا دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں پارٹی کی تنظیم اور عوامی طاقت کے ترجمانوں کے خلاف فوج کو بھیجا گیا" (ص ۸)۔ "بہت سے شہروں میں خاص خاص فیکٹریوں میں فوج کا کنٹرول ہے۔ (صفحہ ۹) "ماؤ گروپ کے لوگ پھر اپنی کاشتکار دشمن پالیسیوں پر عمل کر رہے ہیں جن کی وجہ سے پہلے بھی عوام ناگفتہ بہ مصیبتوں اور تکالیف میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اب ثقافتی انقلاب کے نمائندے نعرہ بازی سے آگے نکل کر نمائشی مقدموں پر آ گئے ہیں اور ہر اس شخص کو گولی مار دیتے ہیں جو ان کی بات نہ مانے" (صفحہ ۱۲)۔ "آج بہت سے لیڈروں پر حملہ کیا جا رہا ہے وہ ماؤ صاحب کے پرانے رفیق اور مددگار رہیں[1]" (صفحہ ۱۴)۔ "کاشتکاروں کی زمین تو بغیر کسی معاوضہ کے کوآپریٹو کی ملکیت بنا دی گئی مگر اس کے برعکس فیکٹریوں اور دکانوں کے سابق مالکان کو ان کے حصص کی قیمت پر اب بھی ۵ فی صد سود مل رہا ہے" (صفحہ ۲۲)۔ "غلط پالیسیوں اور مظالم کا یہ نتیجہ ہوا کہ پیداوار گر گئی ۔۔۔ ۱۹۶۵ء میں پیداوار ۱۹۵۹ء کے مقابلہ میں ۲۶ فیصد کم تھی" (صفحہ ۳۰)۔ "چین میں غلہ کی کڑی راشننگ ہے۔ ۱۹۶۰ء سے چین ۵۰ سے ۶۰ لاکھ من غلہ باہر سے منگواتا ہے جو کہ اس کی کل درآمد کا ۳۰ فیصد ہے" (صفحہ ۳۱)

"آج چین قریب قریب مکمل طور پر نہ صرف صنعتی مشینوں اور پرزوں کے لیے بلکہ خوراک کے معاملہ میں بھی سرمایہ دار ملکوں پر انحصار کرتا ہے۔" (صفحہ ۳۲)

---

[1] گویا چین سٹالن کی راہ پر گامزن ہے اور یہ بات سٹالن کو ہیرو سمجھنے کا منطقی نتیجہ بھی ہے۔

یہ تمام کتاب ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہم ناظرین کو اصل کتاب کی طرف رجوع کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور اپنے دوست ملک چین کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ نظام تو آزما چکا اب اس کے عوام اسلامی نظام پر عمل کر کے اپنے حالات کو سدھاریں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ حضرات جو چینی نظام یہاں درآمد کر کے پاکستان کو اس انجام سے دوچار کرنا چاہتے ہیں، چین تشریف لے جا کر وہاں کے کارفرماؤں کے سامنے اسلام پیش کریں اگر وہ واقعی ان کے دوست اور خیر خواہ ہیں۔

رسائل و مسائل

ازواجِ مطہرات پر "زبان درازی" کا الزام

سوال: آپ نے سورۂ تحریم کی آیت اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا وَاِنْ تَظٰھَرَا عَلَیْہِ ۔ ۔ ۔ ۔ الآیہ کی تشریح کرتے ہوئے تفہیم القرآن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو روایت بخاری اور مُسند احمد سے نقل کی ہے، اس میں حضرت عمرؓ کے الفاظ "لَا تُرَاجِعِی" کا مفہوم "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کبھی زبان درازی نہ کر" (ترجمان القرآن جلد ۲، عدد ۴ صفحہ ۲۲۳ آخری سطر) اگرچہ صحیح ہے لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ ان الفاظ کو بدلنے پر غور فرمائیں کیونکہ اہلِ زیغ نے آپ پر منجملہ بہت سے الزامات کے ایک یہ الزام بھی بڑے زور شور سے پھیلا رکھا ہے کہ مولانا مودودی نے ازواجِ مطہرات کو "زبان دراز" کہہ کر ان کی گستاخی اور بے ادبی کی ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر آپ تفہیم القرآن میں "زبان درازی نہ کر" کے الفاظ کی جگہ "پلٹ کر جواب نہ دے" یا "دو بدو جواب نہ دے" کے الفاظ رکھ دیں تو مفہوم کی صحت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا اور اہلِ زیغ کے ہاتھ میں بھی پروپیگنڈہ کے لیے شوشہ نہیں آئے گا۔"

جواب (از ابوالاعلیٰ مودودی)۔ حضرت عمرؓ کی روایت سے یہ بات تو ثابت ہے کہ ازواجِ مطہرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پلٹ کر یا دُو بدُو جواب دینے لگی تھیں۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی چھوٹا اپنے سے بڑے رُتبے والے کو پلٹ کر جواب دے یا دو بدو جواب دے تو اسی کا نام زبان درازی ہے۔ مثلاً باپ اگر کسی بات پر بیٹے کو ڈانٹ دے یا اظہارِ ناراضی کرے اور بیٹا

اس کو پلٹ کر جواب دے یا دو بدو جواب دینے لگے تو آپ اسے زبان درازی نہیں تو اور کیا کہیں گے؟ کجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ کوئی یہ رویّہ اختیار کرے۔ اب اگر کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بڑھ کر ازواجِ مطہرات کے احترام کی فکر ہے تو اس کا آخر میرے پاس کیا علاج ہے۔ ظاہر ہے کہ ازواجِ مطہرات کا رویّہ کچھ زیادہ ہی ناپسندیدہ ہو گیا تھا جس کی بنا پر پہلے تو حضرت عمرؓ اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ پر غضب ناک ہوتے، پھر ازواجِ مطہرات میں سے ایک ایک کے ہاں جا کر ان کو اللہ کے غضب سے ڈرایا، پھر رسول اللہ صلی اللہ وسلّم نے ناراض ہو کر ۲۹ دن تک ان سے قطع تعلق کر کے اپنے بالاخانے میں قیام فرمایا حتیٰ کہ صحابۂ کرام میں یہ تشویش پھیل گئی کہ حضورؐ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے، اور آخر کار خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اُن کو تنبیہ فرمائی۔ اب اگر یہ محض پلٹ کر جواب دینے یا دُو بدُو جواب دینے ہی کا چھوٹا سا معاملہ تھا تو یہ معترضین اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں کہ ذرا سی بات پر ایک آیت نازل کر دی؟ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا سمجھتے ہیں کہ آیا آپ معاذ اللہ بڑے ہی تُنک مزاج واقع ہوئے تھے کہ ذرا سی بات پر بیویوں سے اس قدر ناراض ہو گئے؟ اور حضرت عمرؓ کو کیا سمجھتے ہیں کہ ذرا سی بات پر بیٹی کو ڈانٹا اور پھر ازواجِ مطہرات میں سے ایک ایک کے گھر جا کر ان کو خدا سے ڈراتے پھرے؟ یہ سب کچھ تو قرآن اور حدیث سے ثابت ہے جسے صرف نقل کرنے کا میں گناہ گار ہوں۔ رہے معترضین تو انہیں بہر حال میری ہر بات پر اعتراض کرنا ہے اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کی کسی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں کروں گا۔ جب تک چاہیں وہ اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتے رہیں۔

"ابو الاعلیٰ" نام پر اعتراض

سوال۔ مولانا مودودی کے خلاف بہت سے اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا جا چکا ہے، مگر ایک اعتراض ایسا ہے جس کا ابھی تک کوئی مفصّل اور مدلّل جواب نہیں دیا گیا

یا پھر اس کا جواب دینا مناسب یا ضروری خیال نہیں کیا گیا، حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس اعتراض کو ایک مدت سے بار بار دُہرایا جا رہا ہے۔ یہ اعتراض مولانا کے نام پر عائد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے الاعلیٰ تو اللہ کا نام ہے اور اس طرح ابُوالاعلیٰ کے معنی (نعوذ باللہ) اللہ کے باپ کے ہوتے ہیں۔ ابلہ فریبی سے کام لیتے ہوئے جب بعض لوگ یہ اعتراض اٹھاتے ہیں اور پھر حاشیہ آرائی اور اشتعال انگیزی کے ساتھ اسے پبلک اسٹیجوں پر پیش کیا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ عامۃ المسلمین سخت متوحش و بدظن ہوتے ہیں اور جو لوگ حسنِ ظن سے کام لیتے ہیں، وہ بھی ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر یہ اعتراض غلط ہے تو اس کی غلطی اچھی طرح واضح کیوں نہیں کر دی جاتی تاکہ اس گمراہ کن پراپیگنڈے کا خاتمہ ہو سکے۔

اس سلسلے میں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ ابُوالاعلیٰ مولانا مودُودی کا اصل نام ہے یا انہوں نے خود اپنی یہ کنیت رکھ لی ہے؟ اگر اس میں غلط فہمی یا اعتراض کی گنجائش ہے تو کیا اسے تبدیل کرنا مناسب نہیں ہے جبکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض نام تبدیل فرمائے اور بعض کنیتیں بھی پسند نہیں فرمائیں بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نام چاہے قابلِ اعتراض نہ ہو، تب بھی اس کا کوئی خاص مفہوم اور مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ ترجمان میں اگر ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اس طرح کے سارے اعتراضات کا جائزہ ایک مرتبہ لے لیا جائے، تو امید ہے کہ لوگوں کے ذہن صاف ہو جائیں گے، ورنہ دوسری صورت میں ایسی اشتعال انگیز اور خطرناک نتائج بھی پیدا کر سکتی ہیں جیسا کہ حال ہی کے بعض واقعات نے ثابت کر دیا ہے۔"

جواب: (از ملک غلام علی صاحب) کسی پڑھے لکھے اور معقول انسان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ لوگوں کے ناموں پر معترض ہو، یا اس طرح کے اعتراضات کو سنجیدہ توجہ کے قابل سمجھے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ بعض جہلاء نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں بے شمار دوسرے اعتراضات کے ساتھ نام پر بھی اعتراض کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے، حتیٰ کہ سادہ لوح عوام الناس کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ

اعلیٰ کے معنی اللہ کے ہیں، اس لیے جس شخص کا نام ابوالاعلیٰ ہے، وہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کا باپ ہونے کا مدعی ہے۔ یہ ایک ایسی بیہودہ حرکت ہے جس کو ہم نے اب تک قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور اس بات پر اعتماد کیا کہ معقول لوگ خود اس بیہودگی کو قابلِ نفرت سمجھیں گے لیکن اب یہ بات اتنی بڑھ گئی ہے کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کی صحیح حقیقت و ماہیت واضح کر دی جائے اور معترضین کی جہالت فریب دہی کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

سب سے پہلی بات جو قابلِ وضاحت ہے وہ یہ ہے کہ ابوالاعلیٰ کنیت نہیں ہے بلکہ والدین کا رکھا ہوا نام ہے جو خاندانِ مودودیہ کے ایک بزرگ حضرت ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۹۳۵ھ) کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ بزرگ سکندر لودھی کے زمانے میں چشت سے نقل مکانی فرما کر ہندوستان میں آئے تھے۔ یہ بزرگ ایک مشہور سلسلۂ ارشاد و ہدایت سے تعلق رکھتے تھے، خود ایک بڑے عالم تھے اور ان کا زمانہ بھی اہلِ علم و تقویٰ سے خالی نہ تھا۔ اگر اس نام میں کوئی پہلو بھی قابلِ اعتراض ہوتا، تو یقیناً اسی زمانے میں علما اور صوفیا اس پر معترض ہوتے اور اسی خاندان میں دوبارہ یہی نام تجویز کیے جانے کی نوبت نہ آتی۔ تاہم اس امر کا اب بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ فی الواقع اعلیٰ اللہ کے اسماءِ حسنیٰ میں شامل ہے یا نہیں اور ابوالاعلیٰ نام رکھنا جائز ہے یا نہیں۔

عام طور پر مشہور ہے اور بعض صحیح احادیث میں بھی یہ بات آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں۔ سننِ ترمذی، کتاب الدعوات کے ایک باب میں (جس کا عنوان نہیں ہے) اس طرح کی احادیث یکجا کر دی گئی ہیں جن میں سے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں یہ پورے ننانوے نام مذکور ہیں۔ مگر ان میں اعلیٰ کا نام موجود نہیں ہے۔ ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب اسماء اللہ میں بھی حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور اس میں بھی الاعلیٰ شامل نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ربّ کی صفت تو اعلیٰ مذکور ہے (مثلاً ربک الاعلیٰ یا ربہ الاعلیٰ)۔ مگر تنہا اعلیٰ کا لفظ اللہ کے اسماءِ حسنیٰ یا صفاتی ناموں میں شامل نہیں کیا گیا۔ صرف یہی نہیں کہ مجرد الاعلیٰ اللہ کے لیے مستعمل نہیں بلکہ عال یا العالی کا لفظ بھی اکیلا اللہ کے لیے قرآن میں وارد نہیں، بلکہ غیر اللہ ہی کے لیے آیا ہے۔ (مثلاً نحو:

عالین، جنۃٍ عالیۃٍ۔عالیھا سافلہا)۔ اعلیٰ کا لفظ عالی ہی کا افعل التفضیل ہے، عالی کے معنی بلند اور اعلیٰ کا مطلب بلند تر۔ اب جو شخص اعلیٰ یا الاعلیٰ کا لفظ مطلقاً بول کر اس سے فقط اللہ تعالیٰ مراد لینا چاہتا ہے اور اس لفظ کو اللہ کے اسماء میں شمار کرتا ہے، وہ بالکل ایک بے دلیل بات کہتا ہے کیونکہ قرآن و حدیث میں کہیں بھی محض لفظ الاعلیٰ بول کر اللہ کی ذات مراد نہیں لی گئی ہے۔

تاہم العالی یا الاعلیٰ کو اللہ کے صفاتی ناموں میں اگر شامل سمجھ بھی لیا جائے کیونکہ بعض علماء کے نزدیک اسمائے حسنیٰ ۹۹ کی گنتی میں محصور و محدود نہیں ہیں تب بھی یہ نام یا الفاظ ایسے ہرگز نہیں ہیں جن کا استعمال غیر اللہ کے لیے ممنوع ہو۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں خود حضرت موسیٰ سے فرماتا ہے: لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (تو مت ڈر، تو ہی اعلیٰ ہے۔ طٰہٰ ۔ ۶۸)، مومنین سے فرماتا ہے: ... وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (اور تم ہی اعلیٰ ہو گے اگر تم مومن ہو گے۔ آل عمران ۔ ۱۳۹) پھر فرماتا ہے ... وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ (اور تم ہی اعلیٰ ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ محمد ۔ ۳۵) اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ جن کا حدیث میں ذکر ہے ان میں صرف چند نام ایسے ہیں جن کے متعلق علماء و محدثین نے یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ کے لیے مختص ہیں اور غیر اللہ کے لیے ان کا استعمال ممنوع ہے۔ وہ اسماء یہ ہیں: اللہ، الرحمٰن، السبّوح، القدّوس۔ ان کے ماسوا تقریباً تمام اسمائے صفات ایسے ہیں جو اللہ و غیر اللہ کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں اور قرآن، حدیث اور لغتِ عرب میں بکثرت ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں یہ الفاظ اللہ اور غیر اللہ دونوں کے لیے آئے ہیں۔ مثلاً الرحیم، الملک، المومن، المہیمن، العزیز، المتکبر، العلیم، السمیع، البصیر، الحسیب الودود، الرؤف اور اس طرح کے اور بہت سے صفاتی نام ایسے ہیں جو قرآن مجید ہی میں اللہ کے لیے اور دوسروں کے لیے یکساں طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن میں اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا اور اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَلِيْمٌ بھی آیا ہے اور علی ایک صحابی کا بھی نام ہے۔ اگر یہ نام کسی لحاظ سے بھی قابلِ اعتراض ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور تبدیل فرما دیتے کیونکہ آپ نے بہت سے ایسے نام بدل دیئے تھے جو کسی پہلو سے ناجائز یا ناپسندیدہ تھے۔ صحاح ستہ کے متعدد راویانِ حدیث ایسے ہیں جو اپنی کنیت ابوعلی کے ساتھ معروف ہیں۔ بوعلی سینا اور بوعلی قلندر کے الفاظ تو زبان زدِ خلائق ہیں۔

بوعلی ابوعلی ہی کا مخفف ہے۔ لیکن آج تک کسی شخص نے یہ کہہ کر اپنی جہالت کا ثبوت نہیں دیا کہ علی چونکہ اللہ کا نام ہے، اس لیے جو علی نام رکھتا ہے، وہ خدا ہونے کا مدّعی ہے اور جو ابوعلی نام یا کنیت رکھتا ہے وہ خدا کا باپ ہے، اسی طرح حکیم اسمائے حُسنیٰ میں شامل ہے اور ایک صحابی کا نام بھی ہے۔ مالک اللہ کا نام بھی ہے، ایک فرشتے کا نام بھی ہے اور مالک ہمارے ایک بہت بڑے امام حدیث وفقہ کا نام بھی ہے۔ پھر ابومالک، ابوحکیم، ابوبصیر ایسی کنیتیں ہیں جن سے ہمارے متعدد اصحاب سلف پہچانے جاتے ہیں۔ اگر یہ سارے نام اور کنیتیں جائز اور صحیح ہیں اور ان کے رکھنے والے نہ خدائی کے دعویدار تھے نہ معاذ اللہ خدا کے باپ ہونے کے مدعی تھے تو کون احمق یہ بات کہہ سکتا ہے یا مان سکتا ہے کہ جس کا نام اُبوالاعلیٰ ہے، اس نے خدا کا باپ ہونے کا (معاذ اللہ) دعویٰ کر دیا ہے۔ آخر جہالت، غباوت اور عناد کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔

پھر جو شخص بھی عربی جانتا ہے اور جس نے دینی علوم میں کچھ بھی شُد بُد پیدا کی ہے، وہ اس بات سے بے خبر نہیں رہ سکتا کہ صحابۂ کرام اور اسلاف عظام میں بے شمار شخصیتیں ایسی تھیں جن کی کنیتیں یا کنیت کے طرز پر جن کے اسمائے گرامی ایسے تھے جن کا صحیح مفہوم مشکل ہی سے متعین ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند ایک یہ ہیں: حضرت ابوبکرؓ، ابوبکرہؓ، ابومحذورہؓ، ابوثعلبہؓ، ابوجندلؓ، ابوبحر، ابولقیانؒ، ابوحنیفہ، ابوالابرد، ابوالاحوص، ابوادام، ابوالاسباط، ابوالاشہب، ابوالبختری، ابوثور، ابوتوبہ، ابوزرعہ، ابوالفرجؒ غرض یہ کہ سینکڑوں ایسے نام ہیں جن کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ ان کا یقینی مفہوم کیا ہے؟ بعض لوگوں نے ان کی حقیقی وجہ تسمیہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ ساری کوششیں تکلف سے خالی نہیں ہیں۔ اب جو عقلمند پوچھتے ہیں کہ اُبوالاعلیٰ سے کیا مُراد ہے، مَیں ان سے پوچھتا ہوں کہ بزرگان سلف میں سے چند نام جو مَیں نے ابھی درج کیے ہیں، کیا یہ بھی آپ نے کبھی پڑھے یا سُنے ہیں اور ان میں کتنے ناموں کی مراد آپ نے بالتحقیق معلوم کر لی ہے؟

پھر جہاں تک کنیت میں لفظ ابو کا تعلق ہے، اس کے معنی ہر حالت میں باپ کے وہی لے سکتا ہے جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہو۔ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت ابوبکرہؓ کی اولاد میں سے کسی کا نام بکر یا بکرہ

نہ تھا۔ اسی طرح ابوحنیفہ کی کسی صاحبزادی یا صاحبزادے
کا نام حنیفہ نہ تھا۔ بعض اوقات ابو کا لفظ باپ کے بجائے اُسی مفہوم میں آتا ہے جس میں عربی کا لفظ "صاحب" یا اُردو کا لفظ "والا" آتا ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ ایک بلی رکھتے تھے، اس لیے ان کا نام ابوہریرہؓ مشہور ہو گیا۔ اس کے معنی بلی والے کے ہیں نہ کہ بلی کے باپ کے۔ حضرت علیؓ ایک مرتبہ مسجد کے کچے خاکی فرش پر لیٹے ہوئے تھے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہِ محبت آپ کو ابوتراب کے لقب سے یاد فرمایا۔ اس کے معنی خاک آلود کے ہیں نہ کہ مٹی کے باپ کے۔ عُذرہ یا عذرا بعض اوقات دوشیزہ کو کہتے ہیں اور جو اس سے نکاح کرے اُسے ابوعُذرہ کہا جاتا ہے، اس سے مُراد کنواری کا شوہر ہے نہ کہ اس کا باپ۔ علامہ ابن الاثیر الجزری جنہوں نے لغتِ حدیث کی مشہور کتاب "النہایہ فی غریب الحدیث والاثر" لکھی ہے ان کی کنیت ابوالسعادات ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صاحب السعادات یا طالبِ سعادت ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ برکات و سعادات کے باپ ہیں۔ ابوالبرکات اور ابوالحسنات کا ترجمہ شاید کوئی جاہل ہی برکات و حسنات کے باپ کر سکتا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا تعارف صرف سرزمین پاکستان تک محدود نہیں ہے، بلکہ اللہ کے فضل و کرم سے ان کے نام، ان کی شخصیت، ان کے افکار و نظریات سے عالمِ عرب کے خواص و عام پوری طرح شناسا ہو چکے ہیں۔ بڑے بڑے اہلِ علم و فضل ان کا نام سنتے ہیں، پڑھتے ہیں، بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ لیکن آج تک ان کے اسمِ گرامی کے متعلق اہلِ لسان اور ذی علم اصحاب کی طرف سے کوئی اشکال و اعتراض سامنے نہیں آیا۔ صرف ہمارے ہاں ہی کے بعض ناقابلِ ذکر اور بزعمِ خود غلط لوگ ہیں جو اپنے مبلغِ علم کا مظاہرہ کرتے پھر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی اور بغض و حسد کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے گھٹیا اعتراضات یہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں بے تکلف دُہراتے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی ان کے دوسرے اعتراضات کو قابلِ توجہ سمجھے تو یہ اس کی اپنی ہی نادانی ہے۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ روز وہ ایک سے ایک بیہودہ اعتراض کرتے چلے جائیں اور ہم ان کے جوابات دینے میں اپنا وقت ضائع کریں۔

(بقیہ اشارات)

پر متمکن ہوئے ہیں اور اب بھی اسی کے لیے کوشاں ہیں یہ سب اسی مایوسی کا بالکل فطری نتیجہ ہے۔

اس منفی طرزِ فکر کا تیسرا اثر نوخیز نسلوں کے اخلاقی انحطاط میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے اندر بے اطمینانی کا وہ احساس نظر نہیں آتا جو کسی اطمینان بخش صورتِ حال کی آرزو میں جھلاتا ہے یہاں سراپا بغاوت، نفرت، حقارت اور تخریب کے طوفان اٹھتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسلیں صرف توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کی دلدادہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ وہ صرف تباہ و برباد کرنے کی آرزو رکھتی ہیں، تعمیر و ترقی سے انہیں کوئی غرض نہیں یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کیا جو کچھ یہ نوجوان آج کر رہے ہیں کیا یہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے؟ صورتِ حال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اس ملک میں اس وقت ہو رہا ہے یہ سارا مذہب سے انحراف کا فطری نتیجہ ہے جسے ایک منصوبے کے تحت شروع کر کے یہاں تک پہنچایا گیا ہے۔ اس کی غرض یہ تھی کہ اہلِ پاکستان، خصوصاً اس کی نوجوان نسلوں کی تہذیب کرنے والے داخلی محرکات کا خاتمہ ہو، ان کے دلوں سے خدا خوفی کا احساس ختم ہو، آخرت کی باز پرس کے خوف سے ان کے دماغ خالی ہو جائیں، سیرت و کردار کے اعلیٰ نمونوں کے خلاف ان کے اندر بیزاری اور تنفر کا جذبہ پیدا ہو اور پھر جب وہ بالکل بے قابو ہو کر تباہی اور بربادی کے لیے نکلیں تو انہیں آہنی شکنجوں میں کس دیا جائے اور عوام کو بھی اس بات پر اطمینان ہو کہ اس ایک حربے کے علاوہ ان کے لیے کوئی دوسرا حربہ کارگر بھی نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ قوم کو آمریت کی جکڑ بندیوں میں جکڑ کر رکھنا چاہتے ہیں وہ شروع ہی سے اس ملک کے باشندوں کو ذہنی اور جذباتی اعتبار سے اس کے لیے تیار کر رہے ہیں نظامِ تعلیم و تربیت سے بالکل غفلت برتی جا رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں شروع ہی سے یہاں جابرانہ قوانین کی بھرمار نظر آتی ہے۔ یہ قوانین آمریت کی طرف پہلا قدم تھے۔ ان کے جواز میں یہ دلیل دی جاتی تھی کہ ملک کے حالات اتنے خراب ہیں

چکے ہیں کہ ان کے بغیر نظم وضبط کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ جابرانہ قوانین صاف بتا رہے تھے کہ ملک کو کس نہج پر آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں جزوی مارشل لا لگا دیا گیا جس کی حیثیت آزمائشی مارشل لا کی تھی تاکہ قوم کے ردِّ عمل کو دیکھا جائے۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں پورے ملک پر آمریت مسلط کر دی گئی۔ اُس وقت مارشل لا لگنے پر عوام نے جس مسرت کا اظہار کیا تھا اس سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ قوم کو آمریت کا کافی حد تک خُوگر بنا دیا گیا ہے اور اس کے ذہن میں یہ بات کسی حد تک بیٹھ چکی ہے کہ اندھی بہری قوت کے بغیر اور جکڑ بندیوں سے بے نیاز ہو کر اس قوم کو ترقی کی راہ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اس دس سالہ دَورِ آمریت میں حکومت نے ایسا منفی طرزِ عمل اختیار کیا جس سے قوم مزید انتشار کا شکار رہوئی۔ اس عہد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہر متبادل قیادت کے اُبھرنے کا امکان ختم کرنے کی کوشش کی گئی، سرکار پرستوں کے سوا ملک کی ہر شخصیت اور جماعت کا اعتماد عوام کے دلوں سے نکال دینے کے لیے تمام ذرائع اختیار کیے گئے، اور تخریبی رجحانات کو اس قدر پروان چڑھایا گیا کہ جب جمہوریت بحال ہونے کے کچھ امکانات پیدا ہونے لگے تو وہ ہنگامے برپا کر دیے گئے جن کی بدولت ملک میں پھر مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔

صدر یحییٰ اگرچہ بار بار اس عزم کا اظہار کر چکے ہیں کہ وہ عنانِ اقتدار عوامی نمائندوں کو سونپ کر خود فوج میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ آج تک انہوں نے اس معاملے میں جو اقدامات کیے اُن سے ان کے عزم کا اخلاص بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر جن تخریب پسند قوتوں نے انسانوں کو ان کی اپنی فطرت سے اور پاکستان کے مستقبل سے مایوس کر دیا ہے اور ان کے اندر ایک ہمہ گیر بغاوت کے رجحانات پیدا کر دیے ہیں، وہ یہ آس لگائے بیٹھی ہیں کہ قوم اب جکڑ بندیوں ہی میں فلاح و کامرانی کی راہ ڈھونڈے گی اور کبھی بھی اس فطری راہ کو اختیار نہ کرے گی جس میں انسان کو انسان سمجھ کر معاملہ کیا جاتا ہے اور سیاسی اور قانونی جکڑ بندیوں کے بجائے اس کی تہذیبِ نفس کی فکر کی جاتی ہے۔

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۴	نومبر ۱۹۷۰ء - مطابق رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ	عدد ۳

مغربی پاکستان — مشرقی پاکستان

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵ - اے ، ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

چندہ سالانہ : آٹھ روپے

فی پرچہ : ۸۰ پیسے

ہوائی ڈاک سے

فی پرچہ ۹۰ پیسے - سالانہ ۱۰ روپے

عام ڈاک سے ۸۰ پیسے ، ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن ، اچھرہ لاہور سے شائع کیا